مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

اجودھیا کے اسلامی آثار

جسمیں اجودھیا ضلع فیض آباد کے علماء مشائخ مشہور مساجد اور
مقبروں کی تاریخ مستند و معتبر حوالوں کیساتھ پیش کی گئی ہے

ناشر

شیخ الہند اکاڈمی دارالعلوم دیوبند

تلك آثارنا تدل علينا
فانظروا بعدنا الی الآثار

اجودھیا کے اسلامی آثار

جس میں اجودھیا ضلع فیض آباد کے علماء، مشائخ، مشہور مساجد اور مقبروں کی تاریخ مستند و معتبر حوالوں کیساتھ پیش کی گئی ہے

تالیف

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ و ایڈیٹر ماہنامہ دار العلوم دیوبند

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH U.P.
دار المصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڈھ - یوپی

ناشر
شیخ الہند اکاڈمی دار العلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی ۶

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند

جملہ حقوق بحق شیخ الہند اکیڈمی محفوظ ہیں

نام کتاب ـــــــــ اجودھیا کے اسلامی آثار

مؤلف ـــــــــ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ وایڈیٹر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

سن تالیف ـــــــــ ۱۹۹۰ء مطابق ۱۴۱۱ھ

طابع وناشر ـــــــــ شیخ الہند اکاڈمی دارالعلوم دیوبند

زیر اہتمام ـــــــــ مولانا ریاست علی بجنوری
استاذ حدیث دارالعلوم ونگران شیخ الہند اکاڈمی

کتابت ـــــــــ محمد اسرائیل غفرلہ القاسمی، دیوبند

تعداد ـــــــــ ایک ہزار

مطبوعہ ـــــــــ پریس دہلی

قیمت ـــــــــ

Accession No. 28437
Class No. 72
Book No. 165

فہرست

عنوان	صفحہ
عرض ناشر	۵
تقریظ	۷
مقدمہ	۹
اجودھیا کی قدامت	۹
اجودھیا کی مذہبی حیثیت	۲۰
باب اوّل علماء و مشائخ کا تذکرہ	۲۷
قاضی قدوۃ الدین	۲۹
شیخ الاسلام فرید الدین اودھی	۳۰
شیخ بدر الدین واعظ	۳۱
قاضی محی الدین کاشانی	۳۱
شیخ تقی الدین علم بخش	۳۳
شیخ شمس الدین اودھی	۳۶
شیخ جلال الدین اودھی	۴۰
مولانا قوام الدین اودھی	۴۲
مولانا جمال الدین اودھی	۴۲
علامہ کمال الدین اودھی	۴۳
شیخ نصیر الدین اودھی	۴۶
شیخ علاء الدین نیلی	۵۱
شیخ زین الدین علی اودھی	۵۳
شیخ شمس الدین اودھی	۵۴
شیخ فتح اللہ اودھی	۵۷
شیخ سعد اللہ اودھی	۶۱
شیخ جمال گوجری	۶۲
سید سلطان موسیٰ عاشقان	۶۴
شیخ صدر الدین اودھی	۶۶
قاضی شہاب الدین اودھی	۶۷
شیخ میان بن حکیم اودھی	۶۹
شیخ محمد درویش اودھی	۶۹
شیخ علاء الدین حسینی اودھی	۷۳
عاشق شاہ اودھی	۷۵
مولانا سید شاہ صفدر حسین اودھی	۷۶
مولانا حکیم محمد اسلم اودھی	۷۷
شیخ عبد الحق اودھی	۷۸
باب دوم اجودھیا کی مشہور مساجد کی تاریخ	۸۱
بابری مسجد	۸۳
اختلاف کی ابتدا	۸۷
مسجد مندر تنازعہ کا مصالحانہ حل اور سامراجی طاقت کا منفی رویہ	۸۹
انگریزوں کے خلاف ہندو مورخین کی تحقیق	۱۰۱
بابری مسجد کو غیر قانونی طور پر مندر بنانے کی نارواکوشش	۱۱۲
جواب دعویٰ از ایس، پی فیض آباد	۱۱۴
ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا بیان	۱۱۴
یوپی سُنّی سنٹرل وقف بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مقدمہ	۱۱۵
مسجد میں غیر قانونی تبدیلی کی کوشش	۱۱۶
تبدیلیوں کی تفصیل	۱۱۶
مسجد کو مندر بنانے کی آخری کوشش	۱۱۷
ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کے فیصلہ کا متن	۱۱۷
مسجد شاہجہانی	۱۲۶
مسجد عالمگیری	۱۲۸
مسجد کی حیثیت بدلنے کی کوشش	۱۲۹
مسجد کے قریب مندر	۱۳۰
ہنومان گڑھی کی تعمیر اور مسجد کا انہدام	۱۳۱

عنوان	صفحہ
مسجد کی بازیابی کی پہلی جدوجہد اور اندوہناک ناکامی	۱۳۱
بازیابی مسجد کی دوسری تحریک	۱۴۰
مجاہدین کی اجودھیا روانگی اور سرکاری وفد کی آمد	۱۴۱
دوسرا سرکاری وفد اور امیر جماعت مولانا امیر علی کی لکھنؤ مراجعت	۱۴۲
وزیر نواب کے دربار میں حاضری	۱۴۲
لکھنؤ سے روانگی	۱۴۴
سرکاری وفد کی آمد	۱۴۵
مولوی مسیح الزماں کا انحراف	۱۴۶
حکومت کی عہد شکنی اور مجاہدین کا عزم سفر	۱۴۷
مجاہدین کو روکنے کی پھر کوشش	۱۴۷
منظوم عرضداشت از مولانا امیر علی شہید ” بخدمت نواب واجد علی شاہ	۱۴۸
قصبہ سہالی سے روانگی	۱۵۰
مجاہدین کے خلاف ایک نئی چال	۱۵۱
تحریک کے خلاف فتویٰ	۱۵۳
استفتار اور اس کے جواب کا حاصل	۱۵۸
دریا باد سے کوچ کا اعلان	۱۵۹
حسین علی کی سازش اور مجاہدین میں انتشار	۱۶۲
لشکر اسلام کی بجانب اجودھیا روانگی اور مجاہدین کی شہادت	۱۶۴
مسجد الہ جائی گھاٹ	۱۷۰
مسجد امیر الدولہ	۱۷۳
باب سوم قابل ذکر مزارات اور مقبروں کی تفصیل	۱۷۵
مزار حضرت شیث علیہ السلام	۱۷۷
مزار کا جائے وقوع	۱۸۳
درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کا احاطہ	۱۸۳
مزار خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء	۱۸۴
مزار پاتی شاہ	۱۸۴
مزار حضرت قطب شاہ	۱۸۵
مزار شاہ بدیع الدین	۱۸۵
مقبرہ تین درویش	۱۸۶
روضہ زین العابدین	۱۸۶
نوگزی قبر	۱۸۷
مزار خواجہ کرٹے شاہ	۱۸۸
مزار حافظ امان اللہ	۱۸۹
مقبرہ شاہ ابراہیم	۱۸۹
مزار شاہ علی اکبر چشتی مودودی	۱۹۰
مزار پیر کشائی	۱۹۱
مقبرہ حضرت مخدوم بندگی نظام	۱۹۲
خانقاہ شاہ مظفر	۱۹۲
مزار پیر نصیر الدین	۱۹۳
مزار حضرت شاہ جلال	۱۹۴
مقبرہ شاہ اویس	۱۹۴
مزار حضرت کمال الدین	۱۹۵
مزار نورالدین شہید	۱۹۶
حوالے کی کتابیں	۱۹۸

عرضِ ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

امابعد! اسلام چونکہ انسانیت کیلئے خداوند عالم کا پسندیدہ آخری مذہب ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں، نیز یہ کہ آپؐ کے بعد مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کو خدا کی مقرر کردہ اس سیدھی راہ کی طرف دعوت دیتے رہیں، اسلئے علماء وصوفیاء نے ہر زمانے میں اور ہر جگہ دین کے چراغ روشن کئے اور انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی جدوجہد کی خصوصاً وہ مقامات جو کسی بھی مذہب کے روحانی پیشواؤں کی توجہات کا مرکز رہے وہاں انھوں نے روشنی کے مینار قائم کئے، اور اس طرح سینۂ گیتی کا چپہ چپہ اسلامی آثار سے منوّر ہو گیا۔

ہندوستان میں اجودھیا کی سرزمین چونکہ اسی حیثیت کی حامل رہی ہے اسلئے وہاں مسلمانوں کے علمی اور روحانی قافلوں کا خیمہ زن ہونا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے اپنا فرضِ منصبی پورا کیا اور اسی زمانہ کی سینکڑوں یادگاریں اجودھیا کی سرزمین پر موجود ہیں، لیکن کچھ دنوں سے ہندوستان میں لیلائے سیاست کے بوالہوس پرستاروں نے، مذہبی استحصال کی ناپسندیدہ روش اختیار کر کے شیوۂ اہل نظر کی آبرو کو خطرہ میں ڈالی ہے اور اسکے نتیجہ میں اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ بن گیا ہے، اس ماحول میں شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ بابری مسجد اور اجودھیا کے دیگر اسلامی آثار کے بارے میں تفصیلی معلومات تحقیق کے ساتھ یکجا ہو جائیں۔

محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی زید مجدہم نے وقتاً فوقتاً اس موضوع پر چند

محققانہ مضامین سپرد قلم کئے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے اہل علم نے ان کی اہمیت محسوس کی اور انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا، بلکہ موصوف سے فرمائش کی گئی کہ وہ اجودھیا کے علمی آثار پر مفصل اور تحقیقی معلومات یکجا کر دیں، اور حقیقت یہ ہیکہ یہ کام مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی جیسے اہل قلم کا منتظر تھا کہ موصوف متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کو اہل علم کے نزدیک مستند اور وقیع سمجھا جاتا ہے۔

ہم ممنون ہیں کہ موصوفِ محترم نے پچاس سے زائد مآخذ کی مدد سے اس موضوع سے متعلق منتشر مواد کو جمع کر کے دل صد پارہ کو یکجا کر دیا۔

"اجودھیا کے اسلامی آثار" میں تقریباً ۲۰ مشاہیر اہل علم اور مشائخ تصوف کا تذکرہ ہے جنھوں نے اجودھیا کی سرزمین میں توحید کا چراغ روشن کیا ہے، انہی حضرات کی متعدد خانقاہوں کا ذکرِ جمیل ہے جہاں ذکرِ الٰہی کی مجلسیں قائم رہی ہیں، کتنے ہی ایسے مقابر و مزارات کی تفصیلات ہیں جن میں علم و معرفت اور شریعت و طریقت کے خزانے مدفون ہیں اور متعدد اہم ترین مسجدوں کے تفصیلی تذکرے ہیں جن سے اسلامی تاریخ وابستہ ہے اور انہی مسجدوں میں ایک بابری مسجد بھی ہے جسکے سلسلے میں یوم تاسیس سے لیکر آجتک کی صحیح مفصل اور مستند سرگزشت سپرد قلم کی گئی ہے

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے اس قابل قدر کتاب کی اشاعت کے موقع پر ہم ایک اچھے کام کی توفیق ارزانی کیلئے پروردگار عالم کے شکر گذار ہیں اور اسی کیساتھ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور اسکے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب زید مجدہم کے ممنون ہیں کہ ان کی سرپرستی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ والحمدللہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

دعا ہیکہ پروردگار عالم کتاب کو عام قارئین اور مسلمانوں کیلئے نفع بخش بنائے مصنفِ قوم کی حسنات میں شمار کرے، اور مسلمانوں کے مستقبل کو، انکے ماضی کی طرح شاندار اور تابناک بنانے میں معاون و مددگار فرمائے، آمین۔

ریاست علی بجنوری غفرلہٗ

خادم شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

تقریظ

از — مؤرخِ اسلام

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً !

تاریخ کے قدیم دور سے زمین کے کچھ ایسے مخصوص حصے رہے ہیں جن کی مذہبی اور روحانی مرکزیت ہمیشہ کسی نہ کسی طرح مسلّم اور ان میں مختلف مذاہب کے لئے ہر دور میں کشش باقی رہتی ہے، اس کی عالمی مثال "ارض مقدسہ" ہے جو دنیا کے تین عظیم مذاہب کا مرکز ہے، اسی طرح ہر ملک میں ایسے مقامات پائے جاتے ہیں، ہمارے ملک میں اجودھیا بھی ایک ایسا ہی مذہبی اور روحانی مرکز ہے، اور یہاں بھی تاریخ کا یہ تسلسل یوں باقی رہا ہے کہ ہندو سادھوؤں، سنتوں اور سنیاسوں کی طرح مسلمان علماء، صوفیہ اور مشائخ کو بھی یہاں کے مرکز ثقل نے اپنی طرف کھینچا ہے، اور دونوں طبقہ نے اپنے اپنے مذہب و مشرب کے حدود میں رہ کر اس سے یوں وابستگی رکھی کہ مندروں اور دیولوں کی قطاروں میں مسجدوں اور خانقاہوں نے اس کی مذہبی اور روحانی حیثیت کو استحکام بخشا، یہی نہیں بلکہ کفرستان اجودھیا کے ایمانی چراغوں نے دہلی تک کے محراب و منبر کو دینی و علمی روشنی بخشی اور یہاں کے علماء و مشائخ کے فیوض و برکات ہندوستان میں عام ہوئے، ماضی قریب تک اجودھیا کے مندروں کے گھنٹے اور مسجدوں کی اذانیں، سادھوؤں سنتوں کے منتر اور صوفیاء و مشائخ کے ذکر و اذکار ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسحور کر رہے تھے، یہاں کی سرزمین میں خاص طور سے مختلف طرق و سلاسل کے صوفیہ اور مشائخ کے لئے ایسی روحانی کشش تھی کہ بہت سے حضرات نے اس کو اپنا مسکن بنایا اور وہ یہیں کی خاک

میں دفن ہوئے، جن کے آثار و علائم آج بھی یہاں مسجدوں اور مزاروں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں تو یہاں کے علماء و مشائخ، مساجد و مقابر اور دیگر آثار کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ایک ایسی جامع اور مستند کتاب کی ضرورت اب بھی شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں ان بزرگوں اور آثار کے حالات علمی اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہوں، خصوصاً موجودہ وقت میں جبکہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے قضیۂ نامرضیہ کی وجہ سے حقائق کے چہرے پر تعصب، فرقہ واریت اور سیاست کے سیاہ پردے ڈال دیئے گئے ہیں، ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی نے اس سلسلہ میں چند تحقیقی مضامین و مقالات شائع کئے تو ملک کے بعض مؤقر مصنفین نے ان سے استفادہ کیا اور اپنی تصنیف میں ان سے مدد لی۔

اور اب اس سلسلہ میں مولانا موصوف کی علمی و تحقیقی کاوش کے بعد "اجودھیا کے اسلامی آثار" کے نام سے ایک مستقل کتاب ہمارے سامنے آرہی ہے جس میں اجودھیا کے علماء و مشائخ، مساجد اور مقابر کے بارے میں نہایت مستند و معتبر معلومات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام سے مسلمانوں کو کس قدر علمی و دینی اور روحانی وابستگی رہی ہے، اس سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کی کتاب "تذکرہ علمائے اعظم گڈھ مقام محمود، اسلام میں امارت کا تصور، وغیرہ کی مقبولیت و شہرت نے ان کے علم و قلم کا تعارف علمی حلقوں میں کرادیا ہے، امید رکھنی چاہیئے کہ ان کی یہ کتاب بھی خواص و عوام میں مقبول ہوگی، اور سیاست کی اندھیری راہوں میں صحیح منزل کی طرف رہبری کرے گی۔

قاضی اطہر مبارکپوری

دارالعلوم دیوبند

۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ ۹ نومبر ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم النبیین وعلی الہ واصحابہ اجمعین، امابعد

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید ست صنادید عجم را

اجودھیا ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے جو فیض آباد شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے۔

اجودھیا کی قدامت

اجودھیا کا سب سے قدیم ذکر والمیک کی رزمیہ نظم رامائن میں ملتا ہے، والمیک کے اس تذکرہ کا خلاصہ یہ ہے۔

"قدیم زمانہ میں ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو (گھاگھرا) کے کنارے واقع تھی اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا (منو انسان کے ابوالآبار کو کہتے ہیں) اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابلِ عبور خندق اس کی حفاظت کا سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کرسکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل

درمنزل عمارتیں اس کی رونق تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔[1]

لیکن والمیک کے اس بیان کو عصر حاضر کے غیر مسلم دانشور بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے چنانچہ سروپلی گوپال، رومیلا تھاپر، بپن رچندر، ایس بھٹاچاریہ، سویرا جیسوال ہربنس مکھیا، کے این پنیکر، آر چمپک لکشمی، ستیش سبروال، بی ڈی چٹوپادھیائے آر، این ورما، کے میناکشی، دلباغ سنگھ، مردولا مکرجی، مادھون پلات، آدتیہ مکرجی ایس ایف رتناگر، نیلادری بھٹاچاریہ، کے کے ترپویدی، یوکیس شرما، کنال چکرورتی، بھگوان سنگھ جوش، راجن گرو کل، ہیمان شوری پوردو درجن تاریخ کے اسکالروں نے متفقہ طور پر والمیک کے اس بیان پر درج ذیل تنقید کی ہے۔

"والمیکی رامائن کے مطابق ایودھیا کے" راجہ رام، کلیگ شروع ہونے سے ہزاروں سال پہلے تریتایگ میں پیدا ہوئے تھے، کلیگ ۳۱۰۲ قم میں شروع ہوتا ہے، اس زمانہ میں آثار قدیمہ کی رو سے ایودھیا آباد ہی نہیں تھا، یہاں سب سے پرانی ممکن بستی آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھی والمیکی رامائن میں بیان کئے گئے طرز زندگی کے برخلاف اس زمانے میں رہن سہن خاصا معمولی اور سادہ تھا، والمیکی میں اعلیٰ شہری زندگی، شاہی محلات اور عمارتوں کا ذکر ہے جن کے لئے آٹھویں صدی قبل مسیح کے آثار قدیمہ سے کسی طرح کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔"[2]

ایک اور ہندو محقق و مورخ ڈاکٹر آر، ایل شکلا پروفیسر دھلی یونیورسٹی

---

[1] رامائن از گرفتھ کتاب ۱ باب ۵ اشلوک ۵ بحوالہ معارف اعظم گڈھ ج جلد ۲۹ ص ۱۰۹ مقالہ بہ عنوان رامائن پر ایک نظر۔

[2] تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، روزنامہ قومی آواز دہلی ۶ر نومبر ۱۹۹۰ء۔

یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

"بعض مؤرخین رامائن میں بیان کئے گئے "رام" کو حقیقی کردار مانتے ہیں، یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں....... اگر ہم اس تحقیق کو مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئیں، اسی مقصد کے تحت تین مقامات کی کھدائی ہوئی، (۱) فیض آباد ضلع میں اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کیلو میٹر شمال میں واقع شرنگویر پور کی (۳) اور الہ آباد میں واقع بھاردواج آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر ہوئی تھی اس وقت وہاں آبادی کی علامتیں عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ سو سال پہلے کی نہیں ملی تھی، اور اب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانہ پر وہاں (اجودھیا) کی کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ سے زیادہ سات سو سال قبل کی آبادی کے آثار پائے گئے (اس سے پہلے کے نہیں) اب اگر یہ مان لیا جائے کہ موجودہ اجودھیا ہی رام جی کی نگری تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کی آبادی کے زمانہ کی تطبیق کیوں نہیں ہوتی کیونکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے کم از کم ڈھائی ہزار سال پہلے کا بیان کیا جاتا ہے، اس تحقیق کے اعتبار سے موجودہ اجودھیا رام جی کی بھومی نہیں ہو سکتا۔" [1]

DARUL MUSANNIFIN ACADEMY AZAMGARH U.P. دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

---

[1] مقالہ رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ شائع شدہ ایک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۲ء ص ۱۲۔

ڈاکٹر شکلا اسی مقالہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"والمیکی رامائن کے مطابق کوسل کا پایہ تخت اجودھیا سرجو ندی (دریائے گھاگھرا) کی داہنی سمت ڈیڑھ یوجن (۱۲ ۱/۲ میل) کے فاصلے پر سرجو سے پورب تھا، جب کہ آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پچھم طرف واقع ہے، والمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا کا تعلق رام جی کے اجودھیا سے قائم نہیں ہوتا"۔

والمیک کی اس روایت کے بالمقابل بعض مسلم تاریخ نویسوں نے شہر اجودھیا کا تعلق ابوالبشر آدم علیہ السلام کے حقیقی و صلبی بیٹے شیث علیہ السلام سے جوڑا ہے اور لکھتے ہیں کہ اجودھیا کے اولین بانی حضرت شیث علیہ السلام ہیں، اور بہت سے مؤرخین نے حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن اجودھیا ہی کو قرار دیا ہے چنانچہ آپ کے نام سے منسوب ایک قبر اجودھیا میں آج بھی موجود ہے، جس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ذکر کی گئی ہے، لیکن آثار قدیمہ کی اس جدید تحقیق کی رو سے یہ روایت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

اجودھیا کے متعلق ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ تریتا یگ کے بعد اجودھیا گم ہو گیا تھا جس کو وکرمادتیہ نے دوبارہ دریافت کیا، اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

" وکرمادتیہ کو جب ایودھیا کی جستجو ہوئی تو انھیں کسی ذریعہ سے پتہ چلا کہ تیرتھوں کے حکمراں پریاگ کو اجودھیا کے جائے وقوع کا علم ہے چنانچہ وکرما انکی خدمت میں پہونچے اور ان سے اجودھیا کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات چاہی، پریاگ نے انھیں اس مقام کی نشاندہی کر دی جہاں پہلے اجودھیا واقع تھا لیکن پریاگ سے صحیح پتہ معلوم کر لینے کے باوجود وکرما اجودھیا کو پا نہیں سکے تو انھوں

نے ایک یوگی سے رجوع کیا، یوگی نے ان سے کہا کہ وہ ایک گائے اور ایک بچھڑی کو کھلے مہار آزاد چھوڑ دیں جس جگہ پہنچ کر بچھڑی کے تھن سے دودھ ٹپکنے لگے وہی اجودھیا ہوگا۔ وکرما نے یوگی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا اور اجودھیا کے پالینے میں کامیاب ہوگئے۔ لے

اس روایت کی تمام تر بنیاد مذہبی خوش اعتقادی پر ہے جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ عصر جدید کے ہندو مورخین جنھوں نے مذہبی خوش عقیدگی کے بجائے تاریخی دلائل وشواہد پر اپنی تحقیق وبحث کی بنیاد رکھی ہے، وہ والمیکی میں مذکور اجودھیا کو ایک شاعرانہ تخیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے۔

موجودہ اجودھیا کی شناخت تاریخی لحاظ سے پانچویں صدی عیسوی سے ہوئی ہے، اس سلسلے میں تاریخ نے اپنے صفحات میں جو تفصیلات محفوظ کی ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان کے راجہ سکند گپت جس کی راجدھانی سکیٹ یا ساکا (موجودہ ساکیت) تھی اپنے بعض سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کا نام تبدیل کرکے اسے اجودھیا سے موسوم کردیا تھا، اجودھیا سے ملحق ساکیت نام کی ایک آبادی آج بھی موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سکیٹ اجودھیا بن جانے کے باوجود ایک حد تک باقی رہا، اسی کے ساتھ سکوں میں اپنا اصلی نام کندہ کرانے کے بجائے جدید نام وکرماجیت کندہ کرایا، بہت سے مورخین کا خیال ہے کہ ان جدت طرازیوں سے اس کا مقصد سوریہ ونسی راجوں کا وقار حاصل کرنا تھا کیونکہ راجہ رام چندر جی کے بارے میں یہی روایت ہے کہ وہ سوریہ ونسی (سورج بنسی) تھے، یہ سکند گپت (الملقب بہ وکرماجیت) خود سانکھیہ دھرم کا پیرو تھا، اور بعد میں بدھ مت

لے تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز ۹ر نومبر ۱۹۹۰ء

کا معتقد ہو گیا تھا، رام جی سے اسے کوئی مذہبی عقیدت نہیں تھی۔

سکند گپت (وکرماجیت) کے بارے میں کننگھم نے لکھا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیروؤں کا دشمن تھا لیکن کننگھم کی یہ سنی سنائی بات درست نہیں ہے کیونکہ ونسنٹ اے اسمتھ نے اپنی مختصر تاریخ ہند میں تاریخی حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ اولاً سانکیہ دھرم کا پیرو تھا بعد میں ایک بدھسٹ عالم کی تبلیغ سے بودھ مت کا معتقد ہو گیا تھا۔ اسمتھ لکھتا ہے۔

۵۵۰ء کے قریبی زمانہ میں بودھ مذہب کے ایک زبردست عالم "بسوبندھو" کی سوانح عمری "پرمارتھ" نامی عالم نے لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اجودھیا کا راجہ بکرماجیت (سکند گپت) جو سانکیہ کے فلسفہ کا پیرو تھا اس کو "بسوبندھو" نے بودھ مذہب کا معتقد بنا لیا تھا، یہ سوانح عمری چینی زبان میں محفوظ رہ گئی ہے۔[1]

مسلم دورِ حکومت میں لکھی گئی تاریخوں میں اجودھیا کا قدرے مفصل ذکر شہنشاہ اکبر کے درباری فاضل علامہ ابو الفضل متوفی ۱۰۱۱ھ نے اپنی فاضلانہ تصنیف آئین اکبری میں کیا ہے، ابو الفضل نے بھی اجودھیا کے بارے میں عوامی روایتوں ہی کے بیان پر اکتفا کیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

اودھ از بزرگ شہرہائے ہند طول صد وہژدہ درجہ وشش دقیقہ، عرض بست وہفت درجہ وبست ودو دقیقہ پیش زماں بدرازا صد وچہل وہشت کروہ وپہناسی وشش آباد بود از گزیں معابد باستان برشمارند، بسواد شہر خاک بیزی کنند وطلا برگیرند، جنگاہ راجہ رام چندر بود در دور تریتا فرماں روائی معنوی باتخت نشینی صوری فراہم داشت یک کروہے شہر دریائے گھگھر

---

[1] مقدمہ تاریخ ہند، اکبر شاہ نجیب آبادی۔ ج ۱ ص ۱۸۸۔

بدریائے سرو پیوستہ پایاں قلعہ بگذرد، نزدایں شہر دو قبر بزرگ ساختند شش و ہفت گزی عامہ خوابگاہ شیث وایوب پیغمبر پندارند وبوے افسانہا برخوانند[1]

اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے اس کا طول البلد ایک سو اٹھارہ درجہ چھ دقیقہ اور عرض البلد ۲۷ درجہ بائیس دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اسکی آبادی ایک سو اڑتالیس کوس لمبائی میں اور چھتیس کوس چوڑائی میں تھی یہ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے، اطراف شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے، یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا جو تریتا دور میں ظاہری و باطنی ریاست کے حامل تھے شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر دریائے گھاگرا دریائے سرجو سے مل گیا ہے۔ اور قلعہ (سلطان سکندر لودھی کا تعمیر کردہ قلعہ جواب دریا برد ہو چکا ہے) کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے نزدیک چھ سات گز لمبی دو قبریں ہیں جنھیں عوام شیثؑ اور ایوبؑ پیغمبر کا مدفن بتاتے ہیں اور ان کے متعلق عجیب وغریب قصے سناتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ اجودھیا کے متعلق یہ درج کیا ہے۔

اجودھیا (بفتح ہمزہ وضم مجہول جیم وسکون واؤ وکسر دال وہائے خفی ویائے تحتانی والف) باودھ مشہور از مشرق تا چہل کروہ معبد شمرند و از شمال تا جنوب بیست کروہ در نہم شکل پچھ ماہ چیت ہنگامہ پرستش فراہم آید۔[2]

اَجُوْدِھیا جو اودھ سے مشہور ہے پورب جانب سے چالیس کوس اور دکھن سے اتر بیس کوس کے علاقہ کو متبرک شمار کرتے ہیں، چیت کی نویں

---

[1] آئین اکبری ج ۲ ص ۸۰۔ [2] آئین اکبری ج ۳ ص ۱۴۔

تاریخ کو یہاں مذہبی میلہ ہوتا ہے:

اجودھیا سے متعلق سب سے مفصل وہ رپورٹ ہے جو الگزنڈر کیننگھم نے ۱۸۷۱ء میں مرتب کی تھی، اس میں مندرج بعض باتیں قطعی طور پر غلط اور فساد انگیزی پر مبنی ہیں، پھر بھی اجودھیا کے بارے میں اب تک اس سے زیادہ معلومات افزا تحریر نہیں لکھی گئی ہے، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط مستحکم ہوگیا تو اپنے سامراجی مقاصد کے تحت حکومت نے جہاں بہت سے کام انجام دیئے وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کرکے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں اور ہر ضلع کے گزیٹر بھی مرتب کرائے، بظاہر یہ کام بہت مفید دکھائی دیا مگر ان ان میں جو زہر بھرا گیا ان سے عام طور پر لوگ بے خبر رہے۔ الگزنڈر کیننگھم ہندوستانی آثار قدیمہ کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے اس کی رپورٹیں آج تک تحقیقی و تاریخی کاموں کے لئے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، کیننگھم نے اپنی رپورٹ کی جلد اول میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے، اس موقع پر اس کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں۔

"چینی سیاح ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ گوتم بدھ وساکا میں چھ سال رہے یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکیت دونوں ایک ہی جگہیں ہیں۔" اس کے بعد وہ اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے

اجودھیا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر میں زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں

میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے تو ضرور ہیں جن سے اینٹیں نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے، یہ شہر ملبوں سے بنا ہے جو اجودھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں، دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجودھیا کا نصف ہے۔

کیننگھم آگے لکھتا ہے۔

" رامائن کے بیان کے مطابق اجودھیا کو " منو " نے آباد کیا، منو انسان کے ابو الآباء سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسرتھ کے زمانہ میں اس میں قلعہ بند شہر تھے پھاٹک بھی تھے، اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں، لیکن ان کا نام و نشان اب دکھائی نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ " رام " کا اجودھیا دریہادبالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں سنہ ۱۴۲۶ ق م میں برباد ہوگیا اس وقت سے وکرماجیت کے زمانہ تک یہ ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو وکرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کی رائے مہمل ہے، ہیون سیانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقتور راجہ سرسوتی کے پڑوس میں کنشک سے بعد کا تھا اور تقریباً سنہ ۵۷ ق م کا زمانہ تھا[1] اور یہی سالی واہانہ کے شروع ساکا سنگ کا زمانہ

---

[1] گپت خاندان کے راجاؤں نے اودھ اور شمالی ہند میں ابتداء سنہ ۳۱۹ تا سنہ ۴۷۰ء سلطنت کی البتہ شالباہن کا زمانہ سنہ ۷۸ء ہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گپت خاندان راجہ شالباہن کے دو سو اکتالیس سال بعد مسند آرائے سلطنت ہوئے ہیں کیننگھم کا بیان اس سلسلے میں مجمل ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے مختصر تاریخ ہند، ص ۱۳۸، از ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔

تھا اس وکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیروؤں کا دشمن تھا، وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجودھیا کی از سر نو تعمیر کی اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی ان کو تلاش کرایا، روایتہً یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجودھیا آیا تو یہ بالکل کھنڈر تھا اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی سرجو کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ مندر، رام چندر، ان کی بیوی سیتا، لکشمن اور شترگھن، ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے تین سو ساٹھ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے کیونکہ راجہ کے قبیلہ کے دیس راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ بیویاں تھیں یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔

کچھ اور آگے چل کر لکھتا ہے۔

اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا تھا[۱] رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے یہ چھوٹا سا

---

[۱] کننگھم اسی رپورٹ میں آگے کی سطروں میں خود لکھتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرماجیت کے بنوائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔ اور اجودھیا پر مسلمانوں کا اقتدار گیارہویں صدی عیسوی کے آخر یا بارہویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں قائم ہوا ہے۔ اس لئے جو مندر ساتویں صدی یعنی مسلمانوں کے آنے سے چار سو سال پہلے ہی تباہ اور ختم ہو چکے تھے انھیں مسلمانوں نے کس طرح مسمار کر دیا؟ دراصل کننگھم نے اس یکسر خلاف عقل افسانہ کو لکھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنا چاہا جو اس کا اور ہر انگریز کا مقصد اولین تھا جس کے حصول کیلئے یہ لوگ خلاف عقل بعید از قیاس اور صد فی صد غلط اور جھوٹی باتوں کے کہنے اور لکھنے سے قطعاً نہیں گھبراتے۔

قلعہ ہے جو دیواروں سے گھرا ہے، یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں لئے ہوئے، جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً پرانا ہے اس کا تعلق منی پربت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے، اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں[1]۔ شہر کے پوربی کونے پر رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا تھا، سرگ دواری یا سورگ دوارہ، سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس کا تعین کیا جاتا ہے، جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا جو اشوک بڑ کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا۔ شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو جس کے بارے میں لوگوں کا یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آکر مرجاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے جہاں رام چندر کے بھائی لکشمن نے اشنان کیا تھا، اور یہاں سے ½ میل کے فاصلے پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر پچھم کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر گپتار گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہیں سے لکشمن غائب ہو گئے تھے اس لئے اس کا نام گپتار ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمن نہیں بلکہ رام غائب ہوئے، سورگ دواری میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی۔

---

[1] ہنومان گڑھی کے اس مندر کی ابتدائی تعمیر نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء کے عہد میں ہوئی ہے اور ہنومان گڑھی کی تعمیر اسکے بھی بعد میں ہوئی، تفصیل کتاب میں ملاحظہ کریں۔

کیننگھم یہ بھی لکھتا ہے۔

"پرانے شہر میں بودھ کے بیس مندر تھے[1]، وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے اسی کے ساتھ، برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی تھی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں دکراجیت کے بنائے ہوئے تین سو ساٹھ مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔[2]

اجودھیا کی مذہبی حیثیت

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھیا رام بھگتی کے مرکز کی حیثیت سے بہت بعد میں متعارف ہوا ہے اس سے پہلے وہ بودھ مت، جین مت، شیومت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، چنانچہ جن بارہ غیر مسلم دانشوروں کا حوالہ گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے وہ مشترکہ طور پر لکھتے ہیں۔

"ایودھیا رام بھگتی کے مرکز کی حیثیت سے بہت بعد میں سامنے آتا ہے پرانے زمانے میں یہ کئی مذاہب کے لئے مقدس مقام رہ چکا ہے، پانچویں صدی سے آٹھویں صدی بلکہ بعد کے کتبوں میں بھی ایودھیا کے باشندوں کے حوالوں میں کہیں بھی اس کا تعلق رام بھگتی سے نہیں ملتا ہے۔[3]

(ایپی گرافیکا انڈیکا ۱۰ ص ۲، ۷۰، ۱۵، ص ۴۳، ۱۔ اص ۱۴)

---

[1] ہیونگ شیانگ کے بیان کے مطابق اس وقت اجودھیا میں بودھوں کے بیس نہیں بلکہ سو مندر تھے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

[2] بابری مسجد، تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں، از سید صباح الدین ص ۴۰ تا ۴۱۔

[3] تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز دہلی ۷ رنومبر ۱۹۹۰ء

پٹنہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق صدر، قدیم ہندوستانی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر رام سرن شرما اپنی کتاب کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا میں لکھتے ہیں۔

"جب ہم ہندو عقائد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اجودھیا کو ازمنۂ وسطیٰ میں تیرتھ استھان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے، اس سے قبل اجودھیا کو یہ مقام حاصل نہیں تھا، وشنو سمرتی کے باب پچاسی میں باون تیرتھ استھانوں کی ایک فہرست ہے جس میں شہروں، تالابوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام موجود ہیں لیکن اس فہرست میں اجودھیا کا نام موجود نہیں ہے، اس سمرتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے قریب لکھی ہے اور اس میں درج تیرتھ گاہوں کی فہرست قدیم ترین فہرست ہے۔[۱]

چین کا مشہور بدھسٹ عالم اور سیاح ہیون شیانگ راجہ ہرش (مشہور بہ راجہ سلادت) کے زمانہ ۶۳۰ئ میں ہندوستان آیا اور تقریباً پندرہ سولہ سال اور بقول مولوی ذکاء اللہ صاحب بیس سال یہاں رہ کر ملک کا چپہ چپہ چھان مارا جس کی مکمل تفصیل اس نے اپنے سفرنامہ میں درج کی ہے، اس کا یہ سفرنامہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا انگریزی اردو وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ہیونگ شیانگ نے اپنی تحریر کے مطابق کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، متھرا، تھانیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بہار، بنگال، آسام، اڑیسہ، مدراس، آندھرا، ممالک متوسط، مہاراشٹر، کوکن، ٹراونکور وغیرہ اہم مقامات کی سیاحت کی، وہ ان جگہوں کے باشندوں، حاکموں اور عالموں

---

[۱] کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ص ۲۰ ہندی ایڈیشن مطبوعہ مئی ۱۹۹۰ئ

کے حالات پوری بصیرت وقابلیت کے ساتھ لکھتا ہے، وہ جب قنوج پہونچتا ہے تو اسے وہاں بودھ مذہب کی سو عبادت گاہیں اور دس ہزار پجاری ملتے ہیں اس وقت وہاں کا راجہ ویش ذات کا راجپوت ہرشا وردھن (راجہ ہرش یعنی راجہ سلادت) تھا جس کے والد کا نام ہیونگ شیانگ پراکر وردھن بتاتا ہے یہ راجہ بودھ مت کا پیرو تھا اور بدھ کی تعلیمات کے مطابق پانچویں سال مہاموکش (کفارۂ گناہ کے لیئے دان کا عظیم میلہ) کرتا تھا، ہیونگ شیانگ نے قنوج میں دریائے گنگا کے کنارے دو سو فٹ بلند اشوک کی لاٹ بھی دیکھی، شہر قنوج کے ایک وہار (بودھ عبادت گاہ) میں اس نے ڈیر سین نامی ایک عالم کی مدد سے بودھ مت کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، قنوج کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہاں سے میں اجودھیا کے لئے روانہ ہوا اور وہاں پہونچ کر اس نے جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے۔

"یہاں (اجودھیا میں) ایک سو عبادت گاہیں (وہار) اور کئی ہزار پجاری ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے اجودھیا میں بودھ مذہب کے قدامت پسند وجدت پسند دونوں فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا" [1]

ہیونگ شیانگ کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں اجودھیا بدھوں کا مرکز تھا، بودھ دھرم والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گوتم بدھ نے اجودھیا میں کچھ دن قیام کیا ہے، لیکن جب بہار کے ایک عظیم برہمن رہنما کمارل نے شیو کی پوجا کی ترویج واشاعت اور بودھ مذہب کی مخالفت میں ایک زبردست تشدد آمیز تحریک شروع کی اور خوش قسمتی سے انھیں دکن کے ایک طاقتور راجہ کی مکمل ہم نوائی بھی حاصل ہو گئی تو بدھسٹ جو پہلے ہی مذہبی تحزب اور باہمی فرقہ بندیوں

---

[1] مقدمہ تاریخ ہند ج ا ص ۱۸۰۔ از اکبر شاہ نجیب آبادی۔

کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چکے تھے اس پر تشدد تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے برہمن رہنما کمارل کے بعد ان کے مشہور چیلے شنکر اچاریہ (جن کا زمانہ آٹھویں صدی کا آخر یا نویں صدی کا ابتدائی متعین کیا جاتا ہے) نے اپنی بے پناہ اور انتھک جدوجہد سے اس تحریک کو ارتقار کی آخری حدوں تک پہونچا دیا، جس کے نتیجے میں بودھوں کے بڑے بڑے ویہار اور قدیم عبادت گاہیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا انھیں شیو کے مندر میں تبدیل کر لیا گیا۔

مہاراشٹر کے ایک مورخ ڈاکٹر جمنا داس نے انگریزی زبان میں شائع شدہ اپنی کتاب "تروپتی بالاجی مندر بدھوں کی عبادت گاہ تھی" کی تلخیص پندرہ روزہ اخبار "دلت وائس" انگریزی مورخہ یکم تا پندرہ جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع کرائی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ میری کتاب میں بودھ مت کے زوال کے صرف ایک پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں بودھ مت کی عبادت گاہوں کو برہمن دھرم کے لئے استعمال کرنے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ماہرین و محققین یہ بات پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ پوری کا جگناتھ مندر، بندھا پور کا وشو بھا مندر، اور بدری ناتھ مندر ابتدا میں بودھ عبادت گاہیں تھیں، آندھرا پردیش کا مشہور تروپتی مندر بھی ایک ایسا ہی مندر ہے جو ابتدا میں بودھ ویہار تھا۔

آگے چل کر ڈاکٹر جمنا داس نے کتاب کی جلدوں اور اس کے ابواب کی تفصیل پر روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ جلد اول کے باب دوم میں بودھ عبادتگاہوں پر برہمنوں کے قبضہ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن میں امراوتی، تیرچرزولا، ایہول انداولی، ایلورا، پوری اور سرنگیری کے مندروں کا ذکر ہے کہ یہ ابتدا میں بودھ ویہار تھے۔ باب سوم میں اس دعویٰ کے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں کہ جگناتھ پوری کا مندر بودھ عبادت گاہ تھی۔ باب چہارم میں ثابت کیا گیا ہے کہ وٹھالہ بندھا پور کا

ہیں کہ سیاری مالا (کیرلا) مندر بودھ خانقاہ تھی، باب پنجم میں اس بات کے ثبوت ہیں کہ سیاری مالا (کیرلا) مندر بودھ خانقاہ تھی، باب ششم میں بیان کیا گیا ہے کہ ورک کا ایا پا مندر پہلے بودھوں کی عبادت گاہ تھی، باب شتم مندر بودھ عبادت گاہ تھی اور کس طرح بدھ "ایا کا" کو لنگ پوجا کے لئے استعمال کیا گیا، باب ہفتم میں اس دعویٰ کو مدلل کیا گیا ہے کہ نیلا ملائی میں سری سیلم مندر ابتدا میں بودھ عبادت گاہ تھی۔[1]

یہ ساری تفصیلات تقریباً ایک خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں جس سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بودھ خانقاہوں کے متعلق نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل اور دشوار امر نہیں ہے، غالب گمان یہی ہے کہ شیومت کے احیار اور بودھ مخالف تحریک کے اسی دور میں اجودھیا کی وہ یکصد خانقاہیں جن کی ہیونگ تیانگ سیاح نے زیارت کی تھی شیو مندروں میں تبدیل کر لی گئیں اور اجودھیا سے بودھ پجاریوں کو دیس نکالا دیکر وہاں سے بودھ مت کی مرکزیت ختم کر دی گئی، اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی تک دیگر ہندو فرقوں کے مقابلے میں شیومت کا ہی اجودھیا میں غلبہ اور بول بالا رہا۔

مذکورہ بالا غیر مسلم دانشوران لکھتے ہیں۔

"تیرہویں صدی عیسوی سے رام بھگتی عوام میں پھیلنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رام نندی فرقہ کی ترقی اور ہندی میں رام کہانی کی ترتیب کے ساتھ اس کا رواج زور پکڑتا ہے، لیکن پندرہویں سولہویں صدی تک بھی رام نندی ایودھیا میں کسی بڑی تعداد میں نہیں بسے تھے شیو بھگتی کی یہاں رام بھگتی سے کہیں زیادہ اہمیت تھی۔"[2]

---

[1] ہفت روزہ نئی دنیا، دہلی ۱۳ تا ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء
[2] تاریخ کا بیجا سیاسی استعمال، قومی آواز، ۲ نومبر ۱۹۹۰ء۔

نامور مؤرخ ڈاکٹر رام سرن شرما تو یہاں تک دعوی کرتے ہیں کہ صرف اجودھیا ہی نہیں بلکہ پورے اتر پردیش میں کسی ایک جگہ بھی سولہویں صدی سے پہلے کوئی رام مندر نہیں پایا گیا ہے کیونکہ اس وقت تک رام بھگتی کا وجود ہی نہیں تھا۔[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رامانج (جو ۱۱۱۶ء میں مدراس کے ایک گاؤں پرمیر میں پیدا ہوئے) نامی ایک ہندو مصلح نے شیومت کی مخالفت پر کمر باندھی اور شیو بھگتی کے مقابلہ میں وشنومت کا پرچار شروع کیا۔ بعد ازاں رامانج کے پانچویں جانشین رامانند (۱۲۹۹ء میں الہ آباد کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے) نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے پورے شمالی ہند میں اس تحریک کو عام کر دیا، وشنومت کے نامور اور مشہور بھگتوں میں ناواجی، سورداس، تلسی داس (جنھوں نے ہندی زبان میں رامائن مرتب کی) جے دیو، اور کبیر داس وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے سولہویں صدی آتے آتے رامانندی فرقہ (وشنومت) کو شیومت پر غلبہ ہو گیا اور شیو پوجا کے بجائے وشنو کے اوتار کی حیثیت سے رام کی پوجا عام ہو گئی، اور اسی زمانہ سے رام کے نام پر مندروں کی تعمیر شروع ہوئی۔[2]

بودھ، شیومت، وشنومت (رامانندی فرقہ) کے علاوہ اجودھیا جین مت کی بھی اہم ترین زیارت گاہ رہ چکا ہے، جینی اپنے پہلے اور تیسرے تیرتھنکر کی جنم بھومی اجودھیا ہی کو بتاتے ہیں، چوتھی، تیسری صدی ق م کا ایک پکی مٹی کا جینی پتلا اجودھیا میں پایا گیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اجودھیا جین مت استھان رہ چکا ہے، مگر آج وہاں اس مذہب کی کوئی علامت اور نشانی نہیں پائی جاتی۔

---

[1] کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا، ہندی ایڈیشن، ص ۲۰، مطبوعہ مئی ۱۹۹۰ء

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، چودھری غلام رسول ایم، اے ص ۱۹۷، اور مختصر تاریخ ہند، ڈبلو ڈبلو ہنٹر اردو ایڈیشن نول کشور ۱۸۹۲ء، ص ۱۵۹، اور ۱۶۱

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد سے اجودھیا میں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی قائم ہوگئی تھی اور ہندوستان کے دیگر مقامات کیطرح اجودھیا کا علاقہ بھی مسلمانوں کے زیر اقتدار آگیا تھا، اور حکومت کی جانب سے اس علاقے کے نظم وضبط کو قائم رکھنے کیلئے امیر و قاضی مقرر تھے ہماری تحقیق کے مطابق اجودھیا کے اولین قاضی شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے خواجہ تاش اور پیر بھائی قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی ہیں جنکی وفات اجودھیا ہی میں ۶۰۵ھ ۱۲۰۸ء میں ہوئی کتاب کے پہلے باب میں ان کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے اس وقت سے لیکر تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی تک اجودھیا پر اسلامی تہذیب و ثقافت چھائی رہی، اس مدت میں اجودھیا کے افق سے علم و فضل کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب چمکے جن کی تابانیوں کے سامنے خود دار الخلافہ دہلی کے علمائے نامدار کے چراغ مدھم پڑ گئے جنکے تذکرے اس کتاب میں آپ پڑھیں گے، اسی سرزمین میں عام روایت کے مطابق حضرت ابو البشر آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے اور جانشین حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن ہے، جسکی زیارت کو مسلمان اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں اور آج بھی پچاسوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے قبرستان اور خانقاہوں و مزارات کے کھنڈرات زبان حال سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اس ارض متبرک پر اسلامی قافلہ کبھی آکر ٹھہرا تھا سہ

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ؛ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

یہ تفصیلات بتا رہی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں ایک مقدس مرکز ہونے کی حیثیت سے اجودھیا کے احوال بدلتے رہے ہیں، کبھی یہ بودھوں کا مرکز توجہ رہا ہے تو کبھی جینیوں نے اپنی عقیدت کے نذرانے اس پر نچھاور کئے ہیں کبھی علمائے اسلام اور مشائخ تصوف نے اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں کا اسے محور بنایا تو کبھی شیومت اور وشنومت کے پجاریوں کا یہ مقصود نظر رہا، غرضیکہ اسکا رشتہ مختلف مذہبوں کی تاریخ سے پیوستہ رہا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر اسے عزت و عظمت کا مقام عطا کیا ہے اسلئے اس شہر پر کسی ایک مذہب کا دعویٰ تاریخی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

حبیب الرحمٰن قاسمی

۲۲ رجمادی الاول ۱۴۱۱ھ ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۰ء

بابِ اوّل

علماء و مشائخ
کا
تذکرہ

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو

ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

(۱)

قاضی قدوۃ الدین

قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ بن ابو العلیٰ اسرائیلی اودھی متقدمین علمائے ہند میں صاحب کمال بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں، علوم و فنون میں مکمل دستگاہ رکھنے کے ساتھ شیخ عثمان ہرونی (مرشد شیخ معین الدین سنجری اجمیری متوفی ۶۳۳ھ) سے سلوک و طریقت کی تحصیل کا شرف بھی انھیں حاصل تھا، ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد یہاں تشریف لائے اور سکونت کے لئے اجودھیا (اودھ) کو منتخب کیا۔

قاضی صاحب نہایت جری اور حق گو تھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں امراء و حکام کی بھی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ۶۰۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی [۱]

بابری مسجد کے سامنے پورب کی جانب پختہ چبوترہ پر آپ کی قبر آج بھی موجود ہے، اور عوام میں "قاضی قدوہ کا مزار" کے نام سے مشہور ہے، اس قبر کے اردگرد بالخصوص جنوب کی سمت بہت سی قبریں تھیں مگر اب انھیں برابر کر کے کھیت بنالیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعزالدین اس دیار کے قاضی مقرر ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بڑی برکت عطا کی اور ان کا سلسلہ اس علاقے میں خوب پھیلا، بقول شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی مؤلف بحر ذخار اس خاندان کے لوگوں نے اجودھیا کے اطراف و جوانب میں تقریباً پچاس گاؤں بسائے،

---

[۱] بحر ذخار بحوالہ نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۹۶۔

چنانچہ سوراپور ضلع فیض آباد، لکھنو، نواب گنج ضلع بارہ بنکی وغیرہ میں اس سلسلے کے لوگ اب بھی موجود ہیں، جو اپنے آپ کو انھیں قاضی قدوۃ الدین کی جانب منسوب کرتے ہوئے قدوائی کہتے اور لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر دبیر مؤلف شہراولیا اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵۹ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں،

"معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوہ نامی شخص کا شہر اودھ (اجودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر آنا ثابت نہیں ہے"

ڈاکٹر صاحب موصوف اگر تھوڑی سی زحمت گوارہ فرماکر بحر ذخار یا نزہۃ الخواطر کو دیکھ لیتے تو اس غلط حاشیہ آرائی سے بچ جاتے۔

(۲)

شیخ الاسلام فریدالدین اودھی

شیخ الاسلام فریدالدین اودھی نحو، لغت، ادب، تفسیر وغیرہ علوم میں امتیازی شان کے مالک تھے، مولانا عبدالحی حسنیؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں "لم یکن مثلہ فی زمانہ" احکام میں امام شافعیؒ کے پیرو تھے، اجودھیا میں شیخ الاسلامی کے باوقار منصب پر فائز تھے اور کار منصبی کے ساتھ طلبہ کو درس بھی دیتے تھے، علامہ شمس الدین بن یحیی اور شیخ علاءالدین نیلی جیسے اساطین امت آپ کے خوان علم کے ریزہ چین تھے، افسوس کی اس یگانۂ روزگار کے تفصیلی حالات وسن وفات دستیاب نہیں، البتہ مولانا شمس الدین اودھی اور مولانا نیلی کا ان سے تلمذ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کے بزرگ ہیں [۱]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۰۸۔

(۳)

شیخ بدر الدین واعظ

شیخ بدر الدین حنفی اودھی صلاح و تقویٰ سے متصف عہد علائی کے زبردست واعظ و مذکر تھے۔ مستقل قیام اجودھیا ہی میں تھا مگر وعظ و تذکیر کی غرض سے گاہے بگاہے دار الحکومت دہلی تشریف لے جاتے اور وہاں مہینوں قیام کر کے خلق خدا کو اپنے مواعظ و نصائح سے مستفید کرتے تھے، مورخ برنی اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

"شیخ بدر الدین زہد و تقویٰ میں بلند مرتبہ کے حامل تھے، گفتگو میں تصنع و تکلف سے پرہیز کرتے تھے، راست گوئی عادت ثانیہ تھی، ان کی مجلس وعظ میں ہر طبقے کے لوگ حاضر ہوتے تھے، وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سامعین روتے روتے نڈھال ہو جایا کرتے تھے۔" [۱]

مزید تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، ہاں علاء الدین خلجی کی عہد سلطنت کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کے ابتدائی عہد کے بزرگ ہیں کیونکہ شاہ علاء الدین خلجی ۶۹۶ھ میں تخت نشین ہوا ہے اور بیس سال حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں وفات پا گیا۔

(۴)

قاضی محی الدین کاشانی

قاضی محی الدین اجودھیا کے ایک ذی اثر خاندان کے فرد فرید تھے سلسلۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے، قاضی محی الدین کاشانی، بن قاضی جلال الدین، بن قاضی قطب الدین

---

[۱] تکملہ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۲ و نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۶۔

ازاولاد زید بن اسود بن سید ابراہیم، بن سید محمد، بن سید قاسم، بن ابراہیم طبا طبا، بن اسمٰعیل بن ابراہیم، بن عمر، بن حسن مثنی بن حضرت حسن بن علی ابن ابی طالب۔[۱]

قاضی کاشانی حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں زہد وتقویٰ اور علمی تبحر میں بلند درجہ رکھتے تھے، ابتدا میں حکومت سے متعلق رہے، لیکن جس وقت شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سرکاری وثیقہ کو پارہ پارہ کر کے فضا میں بکھیر دیا، اور ریاست وامارت کے بجائے فقر ومسکنت کی زندگی اختیار کرلی، بالآخر سلطان المشائخ نے قاضی صاحب کے عمدہ احوال کو دیکھ کر اپنے دست خاص سے خلافت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا، خلافت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

می باید کہ تارک دنیا باشی، بسوئے دنیا وارباب دنیا مائل نہ شوی ودیہ قبول نہ کنی وصلہ بادشاہان نگیری واگر مسافران بتو رسند وبر تو چیزے نباشد ایں حال را غنیمتے ونعمتے شمری از نعمتہائے الٰہی فان فعلت ما امرتک وظنی بک ان تفعل کذالک فانت خلیفتی وان لم تفعل فاللہ خلیفتی علی المسلمین۔[۲]

تارک دنیا رہنا، دنیا اور دنیا والوں کی طرف مت جھکنا، بادشاہوں کی جاگیر اور انعام قبول نہ کرنا اگر مسافر تمہارے مہمان ہوں اور تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس حالت کو غنیمت سمجھنا اور اسے اللہ کی نعمت باور کرنا، اگر تم میرے حکم کے مطابق عمل پیرا رہے اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کروگے تو تم میرے خلیفہ ہو اگر بالفرض تم نے ان باتوں پر عمل نہیں کیا تو پھر مسلمانوں پر میرا قائم مقام اللہ تعالیٰ ہے

قاضی صاحب حسب ہدایت شیخ پوری استقامت کے ساتھ دنیا واہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر یاد الٰہی اور عبادت وریاضت میں مشغول رہے، کچھ دنوں کے بعد تنگدستی اور فقر وفاقہ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ ان کے گھر والے بلبلا اٹھے، اس کیفیت کو دیکھ کر قاضی صاحب

---

[۱] دہلی کے بائیس خواجہ ص ۱۸۰۔ [۲] سیر الاولیاء ص ۲۹۵۔

کے ایک شناسا نے اس کا تذکرہ سلطان علاء الدین خلجی سے کر دیا، سلطان نے اجودھیا کا منصب قضا (جو ان کا موروثی منصب تھا اور اپنے علم وفضل کی بنا پر یہ اس کے اہل بھی تھے) کا پروانہ ان کے نام بھیجدیا، قاضی صاحب حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض رساں ہوئے کہ یہ عہدۂ قضا بغیر کسی طلب کے مرے سپرد کیا جا رہا ہے، اس بارے میں حضرت کا منشا کیا ہے؟ یہ سنکر سلطان المشائخ نے ناخوش ہو کر فرمایا پہلے تمہارے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا، جب ہی تو ایسا ہوا ہے۔ اور خلافت نامہ ان سے واپس لے لیا، تقریباً ایک سال تک شیخ ان سے کبیدہ خاطر رہے، بالآخر امیر خسرو کی سفارش پر راضی ہوئے اور تجدید بیعت کر کے خلافت نامہ واپس فرما دیا، سلطان المشائخ کی حیات ہی میں قاضی صاحب ۷۱۹ھ میں وفات پا گئے۔[۶]

(۵)
شیخ تقی الدین علم بخش

شیخ تقی الدین علم بخش اودھی اپنے عہد کے علمائے کبار ومشائخ عظام میں سے تھے، آپ شیخ داؤد پالہی متوفی ۶۸۰ھ خلیفہ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے برادر زادہ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ماموں تھے۔[۷]

گم گشتہ حالات اجودھیا میں مولوی عبد الکریم اودھی متوفی ۱۳۰۷ھ نے شیخ تقی الدین کو بھی شیخ فرید الدین مسعودؒ کا خلیفہ بتایا ہے مگر یہ بات تشنہ تحقیق ہے اسلئے لائق اعتماد نہیں۔

---

[۶] قاضی کے حالات کے لئے سیر الاولیاء از میر خرد، اخبار الاخیار، از شیخ عبد الحق دہلوی۔ خزینۃ الاصفیاء، غلام سرور لاہوری، تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمان علی، نزہۃ الخواطر ج ۲، اور تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق نظامی دیکھی جائیں، [۷] منبع الانساب از مولوی معین بن شہاب جھوسوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"بغایت متقی بود کار او آں بود کہ کتاب اوردائے داشت آنرا می گرفت و درآخرشب ازخانہ بیروں می آمد تمام روز درجائے مشغول می بود چوں پارہٗ ازشب می گزشت بخانہ می آمد"

بڑے متقی تھے ان کا معمول تھا کہ اپنی وظائف کی کتاب لے کر رات کو پچھلے پہر آبادی سے باہر نکل جاتے اور پورے دن وہیں یاد الٰہی میں مشغول رہتے اور کچھ رات گئے وہاں سے گھر واپس ہوتے۔

آپ کے چچا شیخ داؤد پالہی کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور وہیں دن بھر عبادت حق میں مستغرق رہتے[۹] ممکن ہے شیخ تقی الدین نے اپنے عم محترم سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

جس خوش قسمت کو آپ کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے کی توفیق مل جاتی وہ ان کی انفاس قدسیہ کی برکت سے علم کی دولت سے مالامال ہوجاتا تھا اس لئے لوگ آپ کو علم بخش کہا کرتے تھے، مولوی عبدالکریم اودھی اپنے والد مولوی عبدالرؤف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ والد ماجد کہا کرتے تھے کہ میرے بچپن کے وقت تک طلبہ اور شائقین علم پنجشنبہ کو آپ کے مزار پر حاضر ہوکر ترقی علم وافزائش حفظ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔[۱۰] ماہ رجب ۷۲۶ھ میں آپ نے دار دنیا کو الوداع کہا۔[۱۱]

مزار اجودھیا میں ایٹوا تالاب (جو اس وقت ستیہ ساگر کے نام سے مشہور ہوگیا ہے) کے اوپر ہے۔[۱۲]

لطائف اشرفی کی اس نشاندہی کی بنیاد پر اس وقت آپ مزار تک پہنچنا چاہیں

---

[۹] خزینۃ الاصفیا، ص ۳۱۳۔ [۱۰] گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۵۔ [۱۱] ایضاً

[۱۲] لطائف اشرفی ملفوظات ومکتوبات مخدوم اشرف سمنانی کچھوچھوی۔

تو کبھی بھی نہیں پہونچ سکتے، کیونکہ یہ بیان اب سے تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے کا ہے، اگرچہ ایٹوا تالاب نام کی تبدیلی کے ساتھ سہی اب بھی موجود ہے، مگر اس کے حدود اربعہ یکسر بدل چکے ہیں، اور ایک ایٹوا تالاب کی کیا تخصیص ہے اب تو پورے اجودھیا کے آسمان و زمین کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس نابغۂ عصر اور مردِ کامل کے مزار تک پہونچنے کے لئے درج ذیل تفصیلات بیشِ نظر رکھنی ہوں گی۔

محلہ نوگزی (اس محلہ میں وہ قدیم قبرستان ہے جو نبی نوح سے موسوم ہے اور اسی قبرستان میں وہ مشہور و معروف قبر ہے جو نوگزی کہی جاتی ہے مگر پیمائش میں چودہ گز سے زیادہ لمبی ہے، اسی قبر کے نام پر یہ محلہ نوگزی کہلاتا ہے) سے جانب مشرق تقریباً ۳۰، ۳۲ میٹر کے فاصلے پر "کیوڑا مسجد" ہے، مسجد کی پشت سے ایک راستہ اتر کو جاتا ہے، اس راستہ کو تھوڑی دور طے کرنے کے بعد ایک سڑک ملے گی، اس سڑک سے پورب جانب ۲۰، ۲۲ میٹر چلنے پر "چھوٹی کٹیا" نامی ایک مندر ملے گا، یہ مندر ایک وسیع احاطہ کے اندر ہے، احاطہ میں داخلہ ایک بلند پھاٹک سے ہوتا ہے، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی پھاٹک سے متصل داہنے ہاتھ پر ایک چبوترے پر آپ کو ایک قبر نظر آئے گی۔ یہی حضرت شیخ تقی الدین علم بخش اودھی کی آرام گاہ ہے، مندر کا یہ احاطہ آج سے ایک صدی قبل مسلمانوں کا قبرستان تھا جس میں بے شمار قبریں تھیں، مگر اب شیخ تقی الدین کے علاوہ کسی قبر کا نام و نشان باقی نہیں ہے۔ "مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے"

قبر اگرچہ کافی بوسیدہ ہو گئی ہے مگر مندر کے پجاری اس پر سفیدی کراتے رہتے ہیں اور قبر کے اردگرد حصے کو صاف ستھرا رکھتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر کے بیراگیوں کے دل میں اس کی عزت و حرمت باقی ہے، اگر کوئی بھولے

بھٹکے برائے فاتحہ درگاہ علم بخش کی تلاش میں ادھر آجاتا ہے تو پجاری اس کی رہنمائی کرتے ہیں، اور اسے مزار تک پہونچا دیتے ہیں [۱۳]

(۶)

شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰ اودھی آٹھویں صدی ہجری کے علمار میں علمی تبحر، زہد و تقویٰ اور درس و افادہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، سید محمد علوی (میر خرد) لکھتے ہیں۔

"کار علم و تبحر خدمت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بجائے کشید کہ اوستادانِ شہر بخدمت ایں بزرگ بزانوئے ادب بنشستند و تلمذ کردند.....
بیشتر علمائے شہر منسوب بشاگردیٔ ایں بزرگ اند و سند علم ہائے ظاہری و تحقیق دینی نسبت بداں بزرگ کنند و فخر و مباہات بمجلس رفیع آں بزرگ دانند۔ کسے کہ بہ شاگردیٔ ایں بزرگ منسوب است میاں علمار بغایت معظم و مبجّل و مکرم است" [۱۴]

مولانا کا علمی تفوق اس درجہ کو پہونچا ہوا ہے کہ دہلی کے اساتذہ ان کے سامنے زانوے ادب بچھاتے ہیں، دہلی کے اکثر علمار ان کے شاگرد ہیں، اور علوم و فنون و تحقیقات دینیہ میں مولانا ہی سے استفادہ کرتے ہیں، اور آپ کی علمی مجلس کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں، جسے بھی آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے تو وہ علمار میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے،

---

[۱۳] گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۱۵۔ [۱۴] سیر الاولیار۔ ص ۲۲۶۔

آپ خواجہ تاش اور تلمیذ رشید شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ نے آپ کی علمی سرگرمیوں کی مدح سرائی ان الفاظ میں کی ہے۔

سالت العلم من احیاک حقا فقال العلم شمس الدین یحییٰ[۱۵]

میں نے علم سے پوچھا کہ واقعتاً (اس زمانہ میں) تجھے کس نے زندگی عطا کی، تو علم نے جواب دیا شمس الدین یحییٰ نے۔

مولانا آزاد بلگرامی اپنے محتاط انداز میں یوں رقم طراز ہیں

ثم اقام مولانا شمس الدین فی ظل شیخہ بدھلی فافاد سوادھا الاعظم بالتدریس ومن علی العالم الدراستہ بالتاسیس وانتہت الیہ ریاستہ التدریس بدار الخلافۃ[۱۶]

بعد ازاں اپنے شیخ (نظام الدین اولیار) کے زیر سایہ دہلی میں مقیم ہو گئے اور درس و تدریس کے ذریعہ دہلی میں ایک بہت بڑی جماعت کو علم کی روشنی سے منور کر دیا اور تدریسی مشغلہ میں استحکام پیدا کر کے اس پر احسان فرمایا، دار الخلافہ دہلی میں تدریس کی ریاست آپ پر ختم ہو گئی۔

شیخ شمس الدین اودھی نے علوم و فنون کی تحصیل شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی اور شیخ ظہیر الدین بھکری وغیرہ اساتذہ سے اودھ اور دہلی میں کی تھی، تکمیل درس کے بعد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا، کی خدمت میں رہ کر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں اور خلافت سے مشرف ہوئے، سلطان المشائخ نے جو خلافت نامہ عطا فرمایا تھا، اس پر کتابت کی تاریخ ۲۰ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے[۱۷] سلطان المشائخ خلافت نامہ میں لکھتے ہیں۔

ثم ان الولد الاعز التقی والعالم المرضی المتوجہ الی رب العالمین

۱۵؎ سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی۔ ص ۲۹ - ۱۶؎ ایضاً - ۱۷؎ سیر الاولیار - ص ۲۳۱

شمس الملۃ والدین محمد بن یحییٰ افاض اللہ الواحد انوارہ علی اھل التقوی والیقین۔ لما صح مقصدہ الینا ولبس خرقۃ الارادۃ واستوفی حظہ من صحبتنا اجزت لہ اذا استقام علی اتباع سید الکائنات واستغرق الاوقات بالطاعات ودافت القلوب عن ھواجس النفس والخطرات واعرض الدنیا واسبابھا ولم یرکن الی ابنائھا وارباھا وانقطع الی اللہ بالکلیۃ واشرقت فی قلبہ الانوار القدسیۃ واسرار الملکوتیۃ وانفتح باب الفھم لتعریفات الالھیۃ ان یلبس الخرقۃ المریدین ورشدھم الی مقامات الموقنین الخ[شلہ]

صاحب تقویٰ، پسندیدہ عالم، پروردگار عالم کی جانب متوجہ رہنے والا عزیز فرزند شمس الدین محمد بن یحیی نے (اللہ تعالیٰ اس کے انوار سے اہل یقین اور اصحاب تقویٰ کو مستنیر کرے) جب اپنی نیت ہماری جانب درست کر لی اور ارادت کا خرقہ پہن لیا اور ہماری صحبت سے پوری طرح مستفید ہو گیا (اور میں نے یہ محسوس کیا کہ) وہ سید کائنات کی پیروی میں ثابت قدم ہے اور اپنے اوقات یادِ الٰہی میں مصروف رکھتا ہے اور نفسانی توہمات سے اپنے قلب کو محفوظ رکھتا ہے، اور دنیا اور اسباب دنیا سے رخ موڑ لیا ہے، اور ارباب دنیا کی جانب مائل نہیں ہوتا، اور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اور اس کے قلب میں عالم قدس کے انوار درخشاں اور عالم ملکوت کے اسرار چمک رہے ہیں اور معرفت الٰہیہ کا باب اس پر کھل گیا ہے تو میں نے اسے اجازت وخلافت دیدی کہ وہ مریدین کو بیعت وارادت کا خرقہ پہنائے اور انھیں اہل یقین کی راہ دکھائے۔

شلہ سیر الاولیاء۔ ص ۲۳۰۔

سلطان المشائخ نے آپ کے لئے جن وسیع احوال کا ذکر کیا ہے ان سے طریقت ومعرفت میں آپ کی علوِ شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

سلطان المشائخ کے دامن سے وابستگی کے بعد شیخ اودھی پھر ان سے جدا نہیں ہوئے اور اپنی بقیہ زندگی انھیں کے زیر سایہ گزار دی۔

آپ کے مزاج میں بڑی سادگی تھی، تکلفات اور رسم ورواج کے بالکل پابند نہیں تھے، حتیٰ کہ نکاح بھی نہیں کیا تھا، اور پوری زندگی تجرد میں بسر کردی، امراء و اغنیاء کے دربار میں حاضری گوارا نہ تھی، اور نہ اپنے پاس ان کی آمد ورفت پسند تھی تصوف کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود سجادۂ مشیخت پر بیٹھنے سے گریز کرتے تھے اس لئے جلد کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت سلطان المشائخ کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے ہرگز اپنے پاس محفوظ نہ رکھتا فتوح نامی ایک خادم تھا وہی آپ کے خانگی معاملات کا منتظم تھا، آپ کے کھانے پینے کے انتظام کے علاوہ واردین وصادرین کی تواضع وخاطر داری اسی کے سپرد تھی خود ہر کام سے فارغ البال رہ کر درس وافادہ، تصنیف وتالیف اور ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔[۹۱]

سلطان محمد بن تغلق جس زمانہ میں علماء ومشائخ کو دہلی سے دعوت وتبلیغ کے نام پر ملک کے دور افتادہ خطوں میں بھیج رہا تھا اس موقع پر اس نے شیخ اودھی کو بھی طلب کیا، اور کہا کہ آپ جیسے عالم وفاضل کا یہاں کیا کام، آپ کو تو کشمیر جاکر اشاعت دین کی سعی کرنی چاہئے، اور چند لوگوں کو متعین کردیا کہ وہ شیخ کو جلد از جلد کشمیر روانہ کردیں، حکم سلطانی کے بموجب سامان سفر درست کرنے کے لئے شیخ گھر واپس آئے، اس وقت وہاں جو ارادت مند حاضر تھے انھیں مخاطب کرتے

---

۹۱ سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۵۔

ہوئے فرمایا "اینہاچہ می گویند من بندگی شیخ راخواب دیدہ ام کی مراطلبند من بخدمت خواجہ می روم ایشاں مرا کجامی فرستادند" یہ لوگ کیا بکواس کرتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ مجھے بلا رہے ہیں میں تو اپنے شیخ کے پاس جارہا ہوں، یہ لوگ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن شیخ کے سینہ میں ایک پھوڑا نکل آیا اور اسی عارضہ میں جان جان آفریں کے حوالہ کر دی، اور اپنے شیخ سلطان المشائخ کے حظیرہ میں اندرونی گنبد کے سامنے مدفون ہوئے [۲۰] مولوی رحمٰن علی نے سن وفات ۷۴۷ھ لکھا ہے۔

شیخ اودھی کثیر التصانیف عالم تھے چنانچہ ان کے قریب ہم عصر میر خرد لکھتے ہیں، چندیں تصانیف در علوم دینی از خدمت آں بزرگ در عالم یادگار ماندہ است [۲۱] مولانا بلگرامی لکھتے ہیں " مولانا تصانیف دارد اما دریں عصر کم یافت می شود [۲۲] مولانا صاحب تصانیف ہیں مگر اس وقت ان کی کتابیں کم یافت ہیں۔

گردش لیل و نہار نے اس فاضل اجل کی علمی یادگاروں کو اس طرح محو کر دیا ہے کہ آج "شمس العوارف" اور "شرح مشارق الانوار" کے علاوہ دیگر کتابوں کے نام کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آپ کا تذکرہ سیر الاولیا، اخبار الاخیار، سبحۃ المرجان مآثر الکرام، خزینۃ الاصفیاء، حدائق حنفیہ، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر ج۲ وغیرہ میں موجود ہے۔

(۷)

شیخ جلال الدین اودھی

شیخ جلال الدین اودھی نحو، فقہ اور اصول فقہ کے زبردست عالم اور

---

[۲۰] سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۵ - [۲۱] ایضاً ص ۲۲۶ - [۲۳] مآثر الکرام ص ۱۸۳ -

زہد وتقویٰ سے متصف بزرگ تھے، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، حسب تصریح میر خورد علمائے اودھ میں سب سے پہلے آپ ہی حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تھے، اسی بنار پر تمام علمائے اودھ آپ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میر خرد یہ دلچسپ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ "یاران اودھ" جو سب کے سب عالم وفاضل تھے اور ان میں سے اکثر ایک عرصہ تک علمی اشتغال میں اپنی عمر بسر کر چکے تھے مگر سلطان المشائخ سے بیعت ہوجانے کے بعد ان کے علمی مشاغل جاری نہ رہ سکے، اس لئے سب نے متفق ہو کر شیخ جلال الدین کو تیار کیا کہ سلطان المشائخ سے ہم سب کی طرف سے یہ درخواست کریں کہ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے علمی گفتگو اور بحث وتکرار کی اجازت ہوجائے، چنانچہ شیخ جلال الدین کی قیادت میں یہ سب لوگ سلطان المشائخ کی خدمت میں پہونچے، شیخ جلال الدین نے حسب قرارداد مدعا پیش خدمت کیا، شیخ نے اسے سنکر فرمایا "من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہمچوں پیاز پوست در پوست اند" میں کیا کروں میرا مقصد تو انھیں مغز بنانا ہے مگر یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے ہیں ــــ سلطان المشائخ کے اس جواب کا اثر یہ ہوا کہ شیخ جلال الدین نے دنیا کے تمام بکھیڑوں سے یکسو ہو کر ترک وتجرید کی زندگی اختیار کرلی اور بقیہ زندگی عزلت میں گذار دی۔ میر خرد آخر میں لکھتے ہیں کہ چند روز بیمار رہ کر یہ فرشتہ صفت بزرگ اللہ کو پیارا ہوگیا، میر صاحب نے تاریخ وفات کی تصریح نہیں کی ہے چونکہ خود میر خرد کی وفات ۷۷۰ھ میں ہوئی ہے اس لئے لازمی طور پر شیخ جلال الدین کی رحلت اس سے پہلے ہوئی ہے۔[۲۴]

---

[۲۴] سیر الاولیار۔ ص ۳۰۵/۳۰۶۔ ونزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۲۳۔

(۸)

مولانا قوام الدین اودھی

مولانا قوام الدین معروف بہ یکدانہ شیخ شمس الدین بن یحیٰی کے تلمیذ اور سلطان المشائخ کے مرید تھے، سلطان المشائخ انھیں "مردصالح" کہا کرتے تھے خادم و نوکر کے قطعاً محتاج نہیں تھے، اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھوں کر لیا کرتے تھے، اکثر اوقات ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے، مجاہدہ و ریاضت کا عالم یہ تھا کہ کھانے میں آس (ریچھ) پر اکتفا کرتے تھے، تفصیلی حالات دستیاب نہیں، سیر الاولیاء میں بس یہی چند سطریں ہیں۔

(۹)

مولانا جمال الدین اودھی

شیخ جمال الدین اودھی سلطان المشائخ کے مرید اور متبحر عالم تھے میر خرد اپنے والد اور چچا کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا جمال الدین اودھی جس زمانہ میں مرید ہو کر خانقاہ میں مقیم ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی عالم (جو کثرت مباحثہ کی وجہ سے مولانا بحّاث کے نام سے مشہور تھے) خانقاہ میں آئے اور وہاں موجود علماء مولانا وجیہہ الدین پائلی وغیرہ کی موجودگی میں "بزدوی" کے کسی مسئلہ پر بحث شروع کر دی، بعض علماء کو ساکت بھی کر دیا جس کی بنا پر دوسرے علماء کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوئی، محفل کا یہ رنگ دیکھ کر مولانا جمال الدین سامنے آئے اور مولانا بحّاث سے بحث شروع کر دی اور بالآخر انھیں لاجواب کر دیا۔ مولانا جمال الدین کی اس کامیابی پر خانقاہ کے علماء بہت خوش ہوئے

انھیں مبارکباد اور دعائیں دیں کہ آج آپ نے مولانا بحاث کے سر سے ہمہ دانی کا کا غرور دور کر دیا، اس مجلس میں سلطان المشائخ کے خادم خاص خواجہ اقبال بھی تھے انھوں نے اس واقعہ سے متأثر ہو کر حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ جمال الدین عالم وفاضل ہیں، شیخ نے فرمایا تمھیں کیسے معلوم ہوا، انھوں نے سارا واقعہ سنا دیا سلطان المشائخ نے فرمایا کہ نوجوان کو بلا لاؤ، چنانچہ شیخ جمال الدین احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، شیخ نے انھیں دیکھ کر فرمایا "رحمت بر آمدن تو کہ علم خود را نہ فروختی"، تمھارے آنے پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے اپنے علم کو دنیا کے بدلے فروخت نہیں کیا۔

سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جانے کے بعد علمی مشغلہ قائم نہیں رہا اور اب سارا وقت یاد الٰہی میں گزرنے لگا تھا، سماع سے بھی شغف رکھتے تھے[۲۵]

تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی، صاحب گم گشتہ نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے محلہ نقیبانہ میں قاضی لطف اللہ کی مسجد کے سامنے ہے، گری ہوئی عمارتوں اور بنیادوں کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ وسیع خانقاہ رہی ہوگی[۲۶] اب یہ آثار بھی مٹ گئے اور ان کی جگہ دوسرے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں

"بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے"

(۱۰)

علامہ کمال الدین اودھی

علامہ کمال الدین حامد بن عبدالرحمٰن بن محمد حنفی اودھی شیخ نصیر الدین

---

[۲۵] سیر الاولیاء ص ۳۱۹ ۔ [۲۶] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۷، ۸ ۔

چراغ دہلوی کے بھانجے اور اہم خلفاء میں تھے، آپ کی ولادت ونشو ونما اجودھیا میں ہوئی، یہیں کے علماء سے اکتساب علم کیا بعد ازاں دہلی جاکر اپنے ماموں چراغ دہلی سے بیعت ہوئے اور سلوک و مراحل طے کرکے درجۂ تکمیل وارشاد پر فائز ہوئے۔

علامہ کمال الدین تمام علوم وفنون میں مہارت کا درجہ رکھتے تھے بالخصوص فقہ، اصول فقہ، حدیث اور تفسیر میں تو یگانۂ عصر تھے، اور علمی حلقوں میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے، شجرۃ الانوار میں ہے -

"تا ابتدائے جوانی از فنون علمی بہرہ یاب گشتہ و علم را مرور ایام تمام و کمال ساختہ، ہیچ علمے از و باقی نماندہ بود کہ در وے کمالے بہم نرسانیدہ، و در علم تفسیر و فقہ و حدیث حظے وافر داشت، در میان علماء مفسران و فقہاء و محدثان وغیرہ کہ دراں زمان عَلم علمی افراشتہ بودند علامہ شہرت یافتہ"[۴۷]

نوعمری ہی میں علمی فنون سے بہرہ یاب ہوگئے تھے، اور وقت گذرنے کے ساتھ علمی ترقی کرتے رہے اور کوئی فن ایسا باقی نہیں بچا تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو، بالخصوص تفسیر فقہ اور حدیث پر کامل دستگاہ رکھتے تھے اس عہد کے سر برآوردہ مفسرین، فقہاء اور محدثین میں علامہ کے لقب سے مشہور تھے۔

اپنے شیخ حضرت چراغ دہلی کی تجویز کے مطابق علامہ کمال نے اپنی علمی سرگرمیوں اور دعوت وارشاد کا مرکز گجرات کو بنایا اور طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر علم و دین کی روشنی پھیلاتے رہے، اللہ تعالیٰ نے اس دیار میں انھیں بڑی مقبولیت عطا کی ہر خاص وعام انھیں عظمت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا ۷۲۵ھ کے حدود میں بعہد فیروز شاہ پھر دہلی واپس آگئے تھے، تکملہ سیر الاولیاء میں ہے کہ جس

وقت علامہ کمال الدین گجرات سے دہلی آئے تو ان کے ساتھ تیس اونٹ مال واسباب سے لدے ہوئے تھے، چراغ دہلیؒ نے اس مال واسباب کو دیکھ کر فرمایا، اس قدر دنیا اپنے ساتھ کیوں لائے ہو۔ علامہ نے عرض کیا کہ راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ سلطان المشائخ کی رحلت ہو گئی ہے اور ان کی جگہ آپ سجادۂ مشیخت پر رونق افروز ہیں، اس لئے خیال ہوا کہ اگر خالی ہاتھ جاؤں گا تو لوگ بدگمانیوں میں مبتلا ہوں گے، (ورنہ مجھے اس مال واسباب کی کوئی ضرورت نہیں) اب میں اس سارے مال کو علماء وصوفیاء پر تقسیم کردوں گا، چنانچہ سارا اثاثہ اللہ کے نام پر بانٹ دیا[۲۸] دہلی ہی میں ۷۵۶ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

علامہ کمال اگرچہ خود تو دہلی آگئے تھے مگر اپنی اولاد کو گجرات ہی میں مقیم رہنے کی ہدایت کر آئے تھے تاکہ رشد وہدایت کا جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا تھا وہ چلتا رہے، چنانچہ ان کی اولاد میں برابر ایسے مرد کامل پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علامہ کی مسند دعوت وارشاد کو سونی نہ ہونے دیا، علامہ کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدین نے سجادۂ مشیخت کو زینت بخشی، یہ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے فیروز شاہ بہمنی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا، اسی بناء پر اس نے انھیں دکن آنے کی دعوت دی مگر شیخ سراج نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ حق تعالیٰ مرا در گجرات ہرچہ ضرورت است عطا می فرماید" اللہ تعالیٰ کی عطا سے یہاں ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں (پھر دکن آنے کی کیا ضرورت ہے) ۸۱۷ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

اس کے بعد شیخ سراج کے صاحبزادے شیخ علم الحق مسند ارشاد پر بیٹھے، ان کی نیک نفسی اور للّٰہیت کا اندازہ صاحب شجرۃ الانوار کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی کافر، فاسق اور منکر خدمت

---

[۲۸] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۔

میں حاضر ہوتا اور کچھ دیر بیٹھ کر آپ کی باتوں کو سنتا وہ اسی مجلس میں تائب ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتا تھا۔[۲۹]

شیخ علم الحق کے بعد ان کے بیٹے شیخ راجن سجادہ نشین ہوئے، پھر علی الترتیب شیخ جمال الدین عرف جمن، شیخ حسن محمد اور شیخ یحیی مدنی نے مسند ارشاد کو رونق بخشی تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ کمال کی خانقاہ کے صاحب سجادہ شیخ محمود تھے جو علامہ ہی کی اولاد میں سے تھے۔[۳۰]

علامہ کمال الدین اودھی رح کے حالات کیلئے شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیاء، تذکرہ علمائے ہند، ہدائقہ حنفیہ، نزہۃ الخواطر ج۲، مزارات اولیائے دہلی، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ دیکھی جائیں۔

۱۱

شیخ نصیر الدین اودھی

شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف معروف بہ چراغ دہلی کا مولد و منشا اور آبائی وطن اجودھیا ہی ہے، آپ زبردست عالم و فاضل ہونے کیساتھ اپنے دور کے سرتاج اولیاء تھے، آپ کا سلسلۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔

شیخ نصیر الدین محمود، بن یحیی، بن عبداللطیف، بن یوسف، بن عبدالرشید بن سلیمان، بن احمد، بن یوسف، بن محمد، بن شہاب الدین، بن سلطان، بن اسحاق بن مسعود، بن عبداللہ، بن واعظ اصغر، بن واعظ اکبر، بن اسحاق، بن شیخ ابراہیم بن ادہم بلخی، بن سلیمان، بن ناصر، بن حضرت عبداللہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہم۔[۳۱]

---

[۲۹] شجرۃ الانوار ص ۲۶ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰ ۔ [۳۰] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۱۰
[۳۱] دہلی کے بائیس خواجہ ص ۷۸ ۔

مگر شیخ ابراہیم ادہم بلخیؒ کے بارے میں ابن اثیر، امام بخاری، ابن حجر عسقلانی، سید مرتضیٰ بلگرامی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ عمری نہیں تھے بلکہ تمیمی اور بقول بعض عجلی تھے (تفصیل کے لئے الکامل لابن اثیر جلد ۶، تہذیب التہذیب اتحاف السعادۃ المتقین شرح احیاء العلوم دیکھی جائیں) اس لئے اس شجرۂ نسب پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ نصیر الدین کے دادا، شیخ عبداللطیف نے اپنے آبائی وطن یزد سے ہجرت کر کے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی، پھر آپ کے والد شیخ یحییٰ نے لاہور کی وطنیت ترک کر کے اجودھیا کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اجودھیا ہی میں شیخ نصیر الدین کی ولادت ہوئی۔ ابھی عمر کی صرف نو بہاریں دیکھ پائے تھے کہ والد ماجد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے، اس لئے والدہ ماجدہ کی زیر نگرانی تعلیم وتحصیل کا سلسلہ شروع کیا، ابتداء سے لے کر ہدایہ تک کی کتابیں مولانا عبدالکریم شیروانی سے پڑھیں، اس کے بعد مولانا افتخار الدین محمد گیلانی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے ان ہر دو اساتذہ کے علاوہ شیخ فخر الدین ہانسوی، قاضی محی الدین کاشانی، اور شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۲۵ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔

تعلیمی مشغلہ سے فراغت کے بعد عبادت وریاضت کا داعیہ پیدا ہوا، اس لئے مکان ہی میں عزلت نشین ہو کر ذکر واوراد میں مشغول رہنے لگے، پھر چالیس سال کی عمر میں اجودھیا سے رخت سفر باندھا اور دہلی جا کر حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ بگوش ہو گئے، بالآخر حضرت سلطان المشائخ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرما کر چراغ دہلی کے لقب سے امتیاز بخشا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ نصیر الدین نے

امیر خسروؒ کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ بندہ اودھ (اجودھیا) میں رہتا ہے لیکن وہاں لوگوں کے ازدحام اور کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ذکر و مراقبہ میں خلل پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو کسی جنگل میں تنہا رہ کر یاد حق میں مشغول رہوں، سلطان المشائخ نے امیر خسرو سے فرمایا کہ نصیر الدین سے کہدو "ترا درمیان خلق می باید بود و جفائے خلق می باید کشید و مکافات بہ بذل و عطا می باید کرد۔"[۳۲] تمھیں خلق خدا کے درمیان رہنا اور ان کے جور و ستم سہنا چاہئے اور ان کی زیادتیوں کا بدلہ داد و دہش سے دینا چاہئے۔

پیر و مرشد کے اس فرمان پر شیخ نصیر الدین آخر دم تک عمل پیرا رہے، اور ہر ظلم و ستم و جور و جفا کا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا، سلطان محمد بن تغلق نے انھیں طرح طرح سے پریشان کیا اور اذیتیں دیں جس کی کچھ تفصیل سیر الاولیاء میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن دہلی کا یہ روشن چراغ ظلم و جبر کے تیز و تند طوفانوں کی زد میں بیٹھ کر اپنی ضیا پاشیوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور کرتا رہا اور پیر و مرشد نے آپ سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اپنا خون جگر دے کر انھیں پورا کر دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ فقر و صبر اور تسلیم و رضا کے پیکر اور مہر و محبت کے مجسمہ تھے، سخت سے سخت ناگوار اور اذیت ناک برتاؤ کو نہ صرف مسکراتے ہوئے برداشت کر لیتے تھے بلکہ اس کے عوض ایثار و مروّت اور حسن سلوک کا معاملہ فرماتے تھے، ان کی بلندی اخلاق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ کے مجموعہ ملفوظات خیر المجالس کے تکملہ میں ذکر کیا گیا ہے تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک دن بعد نماز ظہر حجرہ میں تنہا بیٹھے تھے، موقع پا کر "تراب" نامی ایک قلندر اندر گھس گیا، اور نہایت بیدردی کے ساتھ چاقو سے آپ پر وار کرنا شروع کر دیا، آپ کے

---

[۳۲] اخبار الاخیار۔ ص ۸۰۔

جسم میں بارہ زخم لگائے مگر آپ نے بالکل مزاحمت نہیں کی، جسم سے خون نکل کر نالی کے راستہ باہر بہنے لگا جسے دیکھ کر مریدین گھبرائے اور اندر جاکر دیکھا تو ان کی نگاہوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ یہ بیباک قلندر شیخ کو چاقو سے مار رہا ہے اور شیخ ساکت اور خاموش بیٹھے ہیں، مریدین نے اسے پکڑ کر سزا دینی چاہی، لیکن شیخ نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی، قلندر کو اپنے پاس ہی روک لیا اور اپنے مرید خاص مولانا عبدالمقتدر تھانیسری، شیخ صدرالدین طبیب اور خادم خاص و بھانجہ شیخ زین الدین علی کو اپنے پاس بلاکر قسم لی کہ قلندر کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہونچائیں گے، پھر قلندر کو بیس تنکہ (اس عہد کا سکہ) یہ کہہ کر عطا فرمایا کہ شاید چاقو مارنے میں ہاتھ کو تکلیف پہونچی ہو[۳۳]

تسلیم و رضا اور مہر و وفا کا یہ تاجدار ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء کو پیوند خاک ہو گیا۔[۳۴]

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعیں
تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

حضرت سلطان المشائخ کے دامن سے وابستگی کے بعد اگرچہ اجودھیا سے بود و باش کا تعلق باقی نہیں رہا تھا، پھر بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی حد تک رابطہ قائم رہا اور گاہے بگاہے اعزا و اقربا سے ملاقات کے لئے یہاں آتے رہتے تھے، غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں۔

: صاحب اخبار الاولیاء می فرمایند کہ شیخ نصیرالدین را در خطۂ اودھ خواہرے بود از وے کلاں و عفیفۂ زماں و از وے دو پسر داشت یک مولانا زین الدین علی، دوم کمال الدین حامد، شیخ نصیرالدین گاہ گاہ از حضرت شیخ اجازت

---

[۳۳] تکملہ خیرالمجالس ص ۳۱۴، ۳۱۵ - [۳۴] اخبار الاخیار ص -

گرفتہ برائے زیارت ہمشیرہ مکرمہ در اودھ تشریف بردے و بعد حصول ملاقات دے باز آمدے [۳۵]

اخبار الاولیار کے مؤلف لکھتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین کی عفت مآب بڑی بہن اجودھیا میں رہتی تھیں ان کے دو صاحبزادے مولانا زین الدین علی اور مولانا کمال الدین حامد تھے (مولانا کمال الدین کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) شیخ نصیر الدین ہمشیرہ کی ملاقات کی غرض سے باجازت حضرت سلطان المشائخ اجودھیا تشریف لاتے اور ملاقات کے بعد پھر دہلی واپس لوٹ جاتے تھے

اجودھیا ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر جانب مغرب و شمال شیخ نصیر الدین کی ایک ہمشیرہ کا مزار ہے جسے عوام عقیدت و احترام میں "بڑی بوا" کا مقبرہ کہتے ہیں [۳۶]

لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ انھیں خواہر کلاں عفیفہ زماں کا مزار ہے یا کسی دوسری بہن کا البتہ بڑی بوا کے عرفی نام سے ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ یہ انھیں ہمشیرہ کلاں کا مزار ہے جن کی ملاقات کے لئے شیخ دہلی کی طویل مسافت طے کر کے اجودھیا آتے تھے۔ اسی مقبرہ کے قریب اجودھیا اور فیض آباد کے مسلمانوں نے بڑی بوا کے نام سے ایک یتیم خانہ جاری کیا ہے جس میں یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کا مفت انتظام ہے۔

کوشلیا گھاٹ اور محلہ مدار کے درمیان جو آبادی ہے وہ آج سے پچاس سال پہلے تک محلہ چراغ دہلی سے موسوم تھی مگر آج کل اسے عالم گنج کٹرہ کہتے ہیں اسی محلہ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا آبائی مکان تھا جسے بعد میں آپ نے شیخ فتح اللہ اودھی کو دیدیا تھا، شیخ فتح اللہ اسی مکان میں رہتے تھے۔ اور اسی کے متصل ان کا مزار بھی ہے [۳۷] تفصیل آگے آرہی ہے۔ شیخ کے تفصیلی تذکرہ کیلئے

---

[۳۵] خزینۃ الاصفیار، ص ۲۵۴ [۳۶] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۴۔ [۳۷] ایضاً۔ ص ۳۱۔

سیرالاولیار، اخبارالاخیار- خزینۃ الاصفیار وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH U.P.
دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

(۱۲)

شیخ علارالدین نیلی

شیخ علار الدین نیلی اودھی اپنے وقت کے زبردست عالم دین اور صاف نسبت بزرگ تھے، شیخ الاسلام فریدالدین اودھی شافعی کے تلمیذ اور شیخ شمس الدین یحیی اودھی کے رفیق درس تھے، تفسیر کشاف کی تعلیم کے وقت قرأت یہی کرتے تھے، شیخ شمس الدین اور دیگر رفقار درس سامنے ہوتے تھے۔

کشاف اور مفتاح العلوم سکاکی کے غوامض کی توضیح وتشریح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، آپ کی تقریر انتہائی دل نشین اور مؤثر ہوتی تھی، بڑے بڑے علمار و فضلار آپ کی تقریر کے دلدادہ تھے۔[۳۸]

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے، اور شیخ کے اہم خلفار میں شمار ہوتے تھے، سلطان المشائخ کی خصوصی مجلسوں میں تصوف کے اسرار و رموز پر بحکم شیخ آپ کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ اطلاع دیتا ہے کہ ہر جمعہ کو آپ کا عمومی وعظ ہوا کرتا تھا جس کی اثرانگیزی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور بعض تو بے ہوش تک ہو جاتے تھے، ابن بطوطہ اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کی مجلس وعظ میں حاضر تھا، قاری نے قرآن مجید کی آیت "یا ایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم" کی تلاوت کی بعد میں

---

[۳۸] سیرالاولیار، ص ۲۷۵-

مولانا نیلی نے اسی آیت کو پڑھا جسے سنکر مسجد کے گوشہ سے ایک شخص کی چیخ بلند ہوئی، مولانا نے پھر اسی آیت کی تلاوت کی اس شخص نے دوبارہ چیخ ماری اور اسی کے ساتھ جاں بحق ہو گیا، ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں اس مرد حق آگاہ کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شریک رہا۔[۳۹]

مولانا نیلی کے مزاج میں بے پناہ تواضع تھی، تصوف کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے اور سلطان المشائخ کے اہم ترین خلفاء میں شمار ہونے کے باوجود نہ صوفیانہ خرقہ زیب تن کیا اور نہ مدت العمر کسی کو مرید بنایا، کہتے تھے کہ اگر حضرت شیخ حیات سے ہوتے تو اس خلافت نامہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کر کے مؤدبانہ عرض کرتا کہ حضرت نے اگرچہ از راہ بندہ نوازی اس عاجز کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا ہے مگر بندہ اپنے اندر اس بار امانت کے اٹھانے کی طاقت نہیں پاتا۔[۴۰]

آخر عمر میں سلطان المشائخ کے ملفوظات "فوائد الفواد مرتبہ حسن سنجری" کا ایک نسخہ دست خاص سے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا، اور اکثر اوقات اسی کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ہر علم و فن کی مستند و معتبر کتابیں موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف "فوائد الفواد" ہی کا مطالعہ کرتے ہیں؟ فرمایا سلوک اور دیگر فنون کی کتابوں سے دنیا بھری ہے لیکن سلطان المشائخ کے ملفوظات روح افزا جن سے میری نجات وابستہ ہے کہاں ملیں گے۔

مرا نسیم تو باید صبا کجاست کہ نیست
کجاست زلف تو مشک خطا کجاست کہ نیست[۴۱]

بالآخر اپنے عہد کا یہ مرد کامل اور عالم بے بدل حیات مستعار کے دن پورے کر کے ۷۶۲ھ میں رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔[۴۲] اور سلطان المشائخ کے مقبرہ کے احاطہ

---

[۳۹] نزہۃ الخواطر ج ۲۔ [۴۰] سیر الاولیاء ص ۲۷۶۔ [۴۱] ایضاً ص ۲۷۸۔ [۴۲] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۶۱۔

میں اپنے خواجہ تاش رفیق درس اور ہم وطن شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی کے جوار میں ابدی نیند سو رہا ہے۔[۲۳]

"گم گشتہ حالات اجودھیا" اور "شہر اولیار" کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ آپ کا مزار اجودھیا کے مشہور قبرستان "خرد مکہ" میں ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس مقبرہ میں شیخ علاء الدین حسینی، ان کے صاحبزادے شیخ ماہ رو اور ان کی اولاد امجاد کی قبریں ہیں، نام کی یکسانیت سے یہ اشتباہ ہوا ہے۔

سر دست مولانا نیلی کی صرف ایک تصنیف "ما مقیماں" کا پتہ چل سکا ہے۔ ما مقیماں فارسی زبان کی مشہور ترجیع بند مثنوی ہے اور ایک عرصہ تک مدارس کے نصاب درس میں شامل رہی ہے اور اب بھی بعض مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، آپ کے حالات سیر الاولیار، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیار، بحر ذخار قلمی، نزہۃ الخواطر[۲۷] تاریخ مشائخ چشت وغیرہ میں مذکور ہیں۔

(۱۳)

شیخ زین الدین علی اودھی

شیخ زین الدین علی بن عبد الرحمٰن بن محمد حنفی اودھی، علامہ کمال الدین حامد کے برادر حقیقی اور حضرت چراغ دہلی کے بھانجہ، خادم خاص اور خلیفہ تھے، مولانا عبد الحیٔ حسنی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں "ولد بارض اودھ واشتغل بالعلم علی اساتذۃ عصرہ" اجودھیا میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے اساتذہ سے تحصیل علم کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے ماموں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہوئے اور سلوک کی منزلیں طے کر کے خلافت حاصل کی[۲۸] حضرت

---

[۲۶] سیر الاولیار ص ۲۲۱-۲۳۱ [۲۷] نزہۃ الخواطر ج ۲

چراغ دہلی کو آپ سے خصوصی تعلق تھا، اپنی اولاد کی طرح ان کا خیال رکھتے تھے انھیں بھی شیخ سے غایت درجہ محبت تھی، ہمہ وقت خدمت میں لگے رہتے تھے تفصیلی حالات اور سن وفات معلوم نہ ہو سکے۔ وفات کے بعد شیخ چراغ دہلی کے حظیرہ میں مدفون ہوئے، مقبرہ چراغ دہلی کے احاطہ میں تین گنبد ہیں ایک میں خود حضرت چراغ دہلی آسودہ ہیں، دوسرے میں شیخ فرید الدین گنج شکر کی پوتی مدفون ہیں اور تیسرے میں شیخ زین الدین اور ان کے بھائی علامہ کمال الدین محو راحت ہیں۔

موضع چوراسی پرگنہ امیٹھی اور خود امیٹھی میں بھی آپ کی نسل کے لوگ موجود ہیں۔ نزہتہ الخواطر کے علاوہ اخبار الاخیار میں بھی مختصر طور پر آپ کا تذکرہ ہے۔

(۱۴)

شیخ شمس الدین اودھی

شیخ شمس الدین فریادرس بن نظام الدین، اودھی مشہور مشائخ ہند میں ہیں، علوم دینیہ کی تحصیل مولانا رفیع الدین اودھی سے کی اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے، تعلیم سے فراغت کے بعد انھیں سے بیعت بھی ہو گئے تھے بعد میں شیخ اشرف سمنانی کچھوچھوی کی جانب رجوع کیا اور انھیں سے خلافت پائی، آپ مخدوم سید اشرف کچھوچھوی کے خلفائے کبار میں شمار ہوتے ہیں۔

لطائف اشرفی میں ہے کہ شیخ سمنانی فرماتے تھے "اشرف شمس و شمس اشرف است" یعنی دونوں حقیقتاً ایک جان اور ظاہراً دو قالب ہیں، اس سے شیخ شمس الدین کے درجہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لطائف اشرفی میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب مخدوم سمنانی پہلی مرتبہ کچھوچھہ تشریف لائے تو اپنے احباب واصحاب سے فرمایا کرتے

تھے کہ "اجودھیا سے دوست کی خوشبو آرہی ہے"۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہونچ کر حسب عادت ایک مسجد میں قیام پذیر ہوئے آپ کی آمد کی خبر پاکر شہر کے علماء واکابر خدمت میں حاضر ہوئے، ان حاضرین میں شمس الدین نامی ایک نوجوان بھی تھا جو علوم دینیہ کی تکمیل کر چکا تھا، اور اب کسی شیخ کامل کی اسے ضرورت تھی، مخدوم سمنانی نے اس جوان کو دیکھتے ہی فرمایا "شمس الدین میں تمھاری تلاش میں یہاں آیا ہوں"۔[۵۵]

الحاصل انھیں بیعت کر کے اوراد و وظائف کی تلقین کی اور خلوت میں بیٹھنے کا حکم دیا، شیخ شمس الدین نے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا، اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور شیخ کی توجہ خاص کی بدولت سلوک کے مراحل بہت جلد طے کر لئے تکمیل کے بعد شیخ نے اپنی خلافت سے نوازا، اس عرصہ میں شیخ سمنانی اجودھیا ہی میں مقیم رہے، شیخ شمس الدین کو درجہ کمال تک پہنچانے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے اور رسدھور، لکھنؤ، جائس ہوتے ہوئے کچھوچھہ واپس آگئے۔

شیخ سمنانی کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اجودھیا کے منصب دار "سیف اللہ خان" اپنے ندیموں کے ساتھ کچھوچھہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی بزرگی وجلالت شان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی سفر میں آپ سے بیعت ہو گئے، کچھ دن خانقاہ میں قیام کے بعد جب واپس جانے لگے تو شیخ سے درخواست کی کہ اہل اجودھیا کی اصلاح کے لئے آپ کی دعوت وارشاد کا ایک مرکز خود اجودھیا میں بھی ہونا چاہئے، چنانچہ ان کے اصرار پر شیخ سمنانی نے ایک خانقاہ اجودھیا میں بھی قائم کی اور اپنے محبوب ومراد خلیفہ شیخ شمس الدین کو اپنا جانشین بنا کر اہل اجودھیا کی اصلاح وتربیت کی خدمت ان کے

---

[۵۵] سیرت اشرف ص ۳۰۔

سپرد کی، شیخ شمس الدین اسی خانقاہ میں بیٹھ کر زندگی بھر تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفوس کی اہم خدمت انجام دیتے رہے۔[۴۶]

قلب کی طہارت اور روح کی پاکیزگی نے شیخ شمس کی دعاؤں میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ جس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے دست دعا دراز کرتے خدائے قاضی الحاجات اسے پورا کر دیا کرتا تھا اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر عوام و خواص میں "فریاد رس" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے، صاحب بحر ذخار شیخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "شیخ شمس الدین فریاد رس کے لقب سے مشہور ہوئے ان کا مزار اجودھیا میں مرجع خلائق ہے۔"

حسب تحقیق مولوی عبدالکریم اودھی چمنستان اجودھیا کا یہ گل تازہ اپنے شیخ و مرشد کی حیات ہی میں، محرم ۸۰۹ھ یوم جمعہ کو اس جہان خزاں آباد کو الوداع کہہ کر راہی باغ رضواں ہوا۔[۴۷]

لیکن مولانا عبدالحی حسنی کے اس جملہ "تصدر للارشاد بعدہ" یعنی مخدوم سمنانی کے بعد مسند ارشاد کے صدر نشین ہوئے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مخدوم سمنانی کے بعد نہ صرف حیات رہے بلکہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں حضرت مخدوم کی وفات کے بعد ہی بام عروج پر پہنچیں۔ واللہ اعلم۔

آپ کا مزار محلہ بکسر ٹولہ اجودھیا میں اٹوا تالاب (موجودہ ستیہ ساگر) کے گوشۂ شمال مغرب بلندی پر واقع ہے، اب سے پچاس سال پہلے مزار کے چاروں سمت پختہ چہار دیواری تھی، مگر امتداد زمانہ اور شکست و ریخت کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے مغربی دیوار زمین بوس ہو گئی ہے اور بقیہ تین جانب کی دیواریں بھی نہایت خستہ و بوسیدہ ہو گئی ہیں، اگر انھیں اسی حال میں چھوڑ دیا گیا تو وہ

---

[۴۶] سیرت اشرف ص ۴۲۔ [۴۷] گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۰

بھی چند سالوں میں بے نام و نشان ہو جائیں گی۔

گم گشتہ حالات اجودھیا کے مصنف کا بیان ہے کہ مقبرہ کی مرمت اور اسکے دیگر مصارف کے واسطے سلاطین دہلی نے ستر بیگھہ اراضی بطور معافی دی تھی مگر جن صاحب کے نام سند معافی تھی ان کی ناخلف اولاد نے نہ صرف مقبرہ کی اس معافی کو اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا بلکہ مزار کے احاطہ میں مولسری وغیرہ کے جو پرانے درخت تھے انھیں بھی بیراگیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور قیمت ذاتی مصارف میں خرچ کر ڈالی، انھیں لوگوں کے استحصال سے آج مقبرہ بالکل ویران ہے[۴۱]

یہ تربت ماتمی ہے ان حجازی شہسواروں کی
مسلمانوں نے مٹی بیچ لی جن کے مزاروں کی

شیخ شمس الدین نے اپنے پیچھے مریدو مسترشدین کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ تین صاحبزادے چھوڑے، شیخ بدیع الدین جن کی نسل سے موضع کولا ضلع فیض آباد کے شیوخ ہیں۔ دوسرے شیخ جہانگیر ان کے صاحبزادے شیخ علاء الدین تھے جن کے نام پر موضع علاء الدین پور ضلع فیض آباد آباد ہوا، یہیں شیخ علاء الدین کی اولاد بھی ہے اور مزار بھی۔ تیسرے صاحبزادے شیخ احمد تھے جن کے متعلق کچھ صحیح تفصیل معلوم نہ ہو سکی

(۱۵)

شیخ فتح اللہ اودھی

شیخ فتح اللہ بن نظام الدین اپنے عہد کے زبردست عالم اور بلند پایہ شیخ تھے، نحو، فقہ، اصول فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، ان کا آبائی وطن بدایوں تھا، تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے، اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی

---

[۴۱] گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۱۹۔

سرپرستی میں اساتذۂ دہلی سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد مسند درس و افادہ کو زینت بخشی اور طویل عرصہ تک جامع مسجد دہلی متصل منارۂ شمسی (قطب مینار) میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، بعد ازاں حضرت چراغ دہلی کے خلیفۂ خاص شیخ صدر الدین احمد حکیم دلہا متوفی ۵۹۰ھ سے بیعت ہو کر مجاہدہ ریاضت میں لگ گئے، ساتھ ہی تدریسی مشغلہ بھی جاری رہا، لیکن مجاہدۂ بسیار و ریاضت شاقہ کے باوجود دل کی گرہیں نہ کھلیں اور سوز دروں کی جو کیفیت حاصل ہونی چاہیئے تھی وہ میسر نہ ہوئی تو شیخ سے عرض حال کی، پیر و مرشد حکیم دلہا نے فرمایا، تدریسی سلسلہ بند کر دیں اور کتابوں کو اپنے پاس سے علاحدہ کر دیں۔ چنانچہ پیر روشن ضمیر کی تجویز کے مطابق درس کو موقوف کر دیا، اور چند اہم و پسندیدہ کتابوں کے علاوہ پورا کتب خانہ دوسروں کے حوالہ کر دیا، پھر بھی قلب معرفت کی چاشنی سے ناآشنا ہی رہا، شیخ سے دوبارہ رجوع کیا، انھوں نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال سے بالکلیہ انقطاع نہیں ہوا ہے: "العلم حجاب الاکبر" جب تک یہ پردہ درمیان میں حائل ہے معرفت کی روشنی قلب تک نہیں پہونچ سکتی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ فتح اللہ ان عمدہ کتابوں کو جنھیں حرز جان بنائے ہوئے تھے ان کے ایک ایک جز کو الگ کر کے پانی کے کنارے بیٹھے انھیں دھل رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے: "اورا دیدند کہ برلب آبے نشست اجزا رامی شست و آب از چشم اومی رفت"[۲۹] بالآخر لوح دل ماسوی اللہ کے نقش سے بالکل صاف ہو گئی، نور معرفت سے سینہ جگمگا اٹھا اور حضرت حکیم دلہا نے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مقام ارشاد پر فائز ہونے کے بعد حضرت چراغ دہلی اور اپنے پیر و مرشد کے منشاء سے اجودھیا تشریف لائے اور حضرت چراغ دہلی کے آبائی مکان میں فروکش

---

[۲۹] اخبار الاخیار۔ ص ۱۷۴۔

ہوئے جسے حضرت چراغ دہلی نے ان کی تحویل میں دیدیا تھا، شیخ فتح اللہ زندگی کے آخری لمحے تک اسی مکان میں رہے جو رہائش کا کام بھی دیتا تھا اور بندگا خدا کی اصلاح و تربیت کے لئے خانقاہ کا بھی۔

شیخ فتح اللہ کا ہندوستان کے مشائخ کبار میں شمار ہوتا ہے، ان کے فیض تربیت سے ہزاروں گم کردہ راہ صراط مستقیم سے آشنا ہوئے، شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری، شیخ سعدالدین اودھی، شیخ قاسم اودھی، شیخ درویش اودھی جیسے بلند مرتبہ مشائخ چشت ان کے دامن تربیت سے وابستہ اور مرید و خلیفہ تھے، مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:" از کاملین وقت گشت و ہزارہا طالبان حق را بحق رسانید چنانچہ شیخ قاسم دہلوی (اودھی) از خلفائے وے است و نیز شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری مرید و خلیفہ او بود[۱] مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ بھی شیخ اودھی کی خدمت میں بغرض بیعت حاضر ہوئے تھے، لیکن شیخ ردولوی مشرب عشق و محبت کے دلدادہ تھے اور شیخ فتح کی روش زہد و فقر اور تسلیم و رضا کی تھی اس لئے مناسبت پیدا نہ ہو سکی[۲] اسی موقع پر شیخ ردولوی نے اجودھیا میں کئی ماہ قیام کر کے چلہ کشی کی تھی۔

شیخ فتح اللہ جب دہلی سے رخصت ہو کر اجودھیا کے لئے عازم سفر ہوئے تو ان کے شیخ حضرت حکیم دلہانے اپنے دو صاحبزادوں شیخ یحییٰ و شیخ نور کو بغرض تعلیم و تربیت ان کے حوالہ کر دیا تھا، شیخ اودھی نے دونوں مخدوم زادوں کو علوم ظاہر و باطن سے آراستہ کر کے بغرض دعوت و تبلیغ اجودھیا سے جانب مشرق ۳۰/۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آبادی میں بھیجدیا جہاں پہنچکر ان دونوں حضرات نے مستقل سکونت اختیار کر لی، یہ مقام آج کل" اونچا گاؤں "کے نام سے

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۸۰ جلد اول۔ [۲] اخبار الاخیار، ص ۱۹۴/۱۹۵

مشہور ہے، اسی موضع میں دونوں حضرات کے مزارات ہیں اور ان کی اولاد اب بھی یہاں موجود ہے، مولانا عزیز احمد قاسمی بی، اے استاذ دارالعلوم دیوبند اسی اونچا گاؤں کے رہنے والے اور شیخ یحییٰ کی نسل سے تھے، مولانا موصوف کا شجرۂ نسب شیخ صدرالدین حکیم دلہا تک یہ ہے۔

مولانا عزیز احمد، ابن محمد فاروق، ابن الٰہی بخش، ابن محمد اشرف، ابن راحت علی، ابن عباد اللہ، ابن خدا بخش، ابن محمد ہادی، ابن محمد زاہد، ابن اللہ دیا، ابن ابوبکر ابن عبدالملک، ابن مخدوم یحییٰ، ابن شیخ صدر الدین حکیم دلہا[۵۲]

۲۶ ربیع الاول ۸۲۱ھ کو شیخ فتح اللہ کا وصال ہوا مزار اجودھیا میں ہے[۵۳]

مکاتیب شیخ فتح اللہ کے نام سے ایک مجموعہ کسی مرید نے جمع کیا تھا جو شائع بھی ہوا تھا مگر اس وقت نایاب ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بعض مکاتیب کے اجزاء اخبار الاخیار میں نقل کئے ہیں۔

شیخ اودھی کا مقبرہ محلہ چراغ دہلی (موجودہ عالم گنج کٹڑا) اجودھیا میں خود انھی کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے، مزار آج بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے مزار اور خانقاہ کی مرمت حسب تصریح صاحب گم گشتہ حالات اجودھیا اب تک تین بار ہو چکی ہے، سب سے پہلے واجد علی ناظم اودھ نے اس کی شکست و ریخت کو درست کرایا، کچھ دنوں کے بعد خانقاہ کا ایک حصہ گر گیا تو شیخ رمضان علی تاجر فیض آباد نے اس کی مرمت کرائی اور گرے حصہ کو از سر نو تعمیر کرا دیا، پھر تیسری بار ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء میں خواجہ برکات اللہ اعظم گڑھی نے مرمت کرائی اور خانقاہ و مزار کے اردگرد چہار دیواری قائم کردی اور خانقاہ کی مسجد کی مرمت ڈیڑھ صدی قبل سید محمد بخش کرنالی رسالہ دار نے کرائی تھی، اس کے ایک عرصہ کے بعد رسالہ دار

---

[۵۲] از خاندانی شجرۂ مولانا عزیز احمد قاسمی [۵۳] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۰۴

موصوف کے برادر زادہ سید جعفر کرنالی نے دوبارہ اس کی اصلاح و مرمت کرائی ۵۴
خانقاہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار کے متصل آپ کے خلیفۂ خاص شیخ قاسم اودھی کا مدفن ہے، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی عالم و فقیہ اور ولی کامل تھے، سلوک کی تحصیل پہلے اپنے والد شیخ برہان الدین سے کی، پھر شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور انھیں کی رہنمائی میں طریقت کی راہیں طے کر کے درجۂ ارشاد و تلقین کو پہنچے ۵۵

(۱۶) شیخ سعد اللہ اودھی

شیخ سعد اللہ اودھی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، ممکن ہے مرآۃ الاسرار یا بحر ذخار میں ان کا تذکرہ اور تفصیلی حالات ہوں مگر اس وقت یہ کتابیں پیش نظر نہیں ہیں، مولانا عبدالحی حسنی نے شیخ محمد بن قاسم اودھی (المعروف بہ شیخ درویش) کے تذکرہ میں ضمناً گلزار ابرار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفہ تھے ۵۶

تذکرۃ العابدین کے مصنف لکھتے ہیں کہ آپ خلیفہ شیخ فتح اللہ اودھی کے ہیں، آپ بہت بڑے مشائخ طریقت تھے مگر اپنا حال ہمیشہ پوشیدہ رکھا کسی پر یہ ظاہر نہ ہوا کہ آپ کا کیا حال اور طریق ہے، وفات آپ کی ۱۰ ذیقعدہ ۸۵۰ھ میں ہوئی اور مزار اودھ میں ہے ۵۷

---

۵۴ گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۲۵۔ ۵۵ نزہۃ الخواطر ج ۳۔ ص ۱۱۹۔
۵۶ نزہۃ الخواطر ج ۳۔ ص ۱۴۵۔ ۵۷ تذکرۃ العابدین۔ ص ۱۰۲۔

(۱۷)

شیخ جمال گوجری

شیخ جمال الدین گوجری اودھی، عظیم المرتبت، صاحب نسبت اور بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے پانچ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب شیخ نجم الدین کبریٰ سے مربوط ہو جاتا ہے، اپنے زہد و ورع، مجاہدہ و ریاضت اور کریم النفسی و شفقت علی الخلق کی بنا پر شیخ الاولیار کے لقب سے مشہور تھے۔[۸] شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ فرماتے ہیں۔ از بھکر تا پنڈوہ مسافرت کردم باہیچ مسلمانے ملاقات نہ شد الا در اودھ یک بچہ دیدم، واشارت بشیخ جمال کرد۔[۹] (بھکر سے پنڈوہ تک سفر کیا مگر کسی دکامل) مسلمان سے ملاقات نہیں ہوئی، البتہ اودھ میں ایک شخص جمال گوجر کو دیکھا

شیخ جمال سلسلۂ فردوسیہ کے مشہور و بلند پایہ بزرگ شیخ مظفر بلخی، متوفیٰ ۸۰۳ھ کے مرید و خلیفہ تھے، اور انھیں کے حسب منشار اجودھیا میں سکونت پذیر تھے، شیخ فتح اللہ اودھی اور شاہ سید سلطان موسیٰ عاشقان اودھی آپ کے معاصرین میں تھے، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شیخ احمد عبدالحق ردولوی بھی اجودھیا میں اقامت گزیں تھے، ان بزرگوں کے اجتماع سے اجودھیا دارالاولیا بن گیا تھا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ جمال گوجری شیخ ردولوی کی مجلس کے حاضر باش اور ان کے دام محبت میں گرفتار تھے۔ محدث دہلوی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ احمد ردولوی اجودھیا میں مقیم تھے ان کے ساتھ ایک کتیا بھی تھی، اس نے جب بچہ جنا تو شیخ نے اس کی تقریب میں تمام اعیان و اکابر اور امراء شہر کی دعوت کی، لیکن شیخ جمال گوجری کو مدعو نہیں کیا، انھیں شیخ کی اس

۸ھ خزینۃ الاصفیار، جلد ۲ ص ۲۳۱ - ۹ھ اخبار الاخیار۔ ص

بے اعتنائی پر حیرت ہوئی چنانچہ دوسرے دن ان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ کل کی دعوت میں آنجناب بندہ کو بھول گئے، شیخ ردولوی نے یہ سنکر فرمایا۔ جمال الدین میزبانی سگ بود، سگاں راطلبیدیم کہ " الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب " تو از جملہ آدمیانی تراچوں طلبم "۔ ؎ جمال الدین یہ تو کتے کی میزبانی تھی اس لئے کتوں کو دعوت دی گئی کیونکہ (حسب ارشاد نبیؐ پاک) دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں، تم تو ایک آدمی ہو اس میں تمھیں کیسے مدعو کر سکتا تھا۔

شفقت علی الحق کے جذبہ سے شیخ جمال الدین بسا اوقات کھچڑی کی دیگ تیار کرا کر خود اپنے سر پر لئے اجودھیا کے گلی کوچے میں گھومتے پھرتے، جہاں کہیں کوئی بھوکا مل جاتا اسے وہ کھچڑی دیدیتے، ایک دن حسب عادت شیخ جمال کھچڑی کی دیگ سر پر لئے کسی اور طرف جانے کے بجائے اتفاقاً سید سلطان موسیٰ عاشقان کی خانقاہ میں پہونچ گئے اور دیگ شیخ عاشقان کے آگے رکھ دی انکے یہاں تین دن سے فاقہ چل رہا تھا، شیخ جمال کی اس بر وقت پیش کش پر سید عاشقان بیحد ممنون ہوئے اور جزاک اللہ کہتے ہوئے فرمایا " جمال تو دیگِ طعام (برنگِ گوجراں کہ سبوئے شیر برسر گرفتہ می فروشند) گرفتہ می گردی لیکن بہ بہائے عشق می فروشی "۔ اے جمال تم گوجروں کی طرح (جو دودھ کی ٹھلیا سر پر رکھے بیچتے پھرتے ہیں) کھانے کی دیگ سر پر لئے گھومتے ہو، لیکن (سچ تو یہ ہے کہ اسے) عشق و محبت کی قیمت کے عوض فروخت کرتے ہو۔ کہتے ہیں کہ اسی دن سے شیخ جمال گوجر کے لقب سے پکارے جانے لگے اور پھر اسے اتنی شہرت ہوئی کہ نام کا جزو بن گیا، آپ کی وفات ۸۵۸ھ میں ہوئی ؎۶۱

مزار محلہ بکسریا ٹولہ اجودھیا میں ایک احاطہ کے اندر تھا، مگر عرصہ ہوا احاطہ

؎ اخبار الاخیار ،ص ۱۹۶ ؎۶۱ خزینۃ الاصفیار ج ۲ ،ص ۳۲۱۔

کی دیواریں گر کر بے نشان ہو گئی ہیں، البتہ کچھ شکستہ قبریں اب بھی موجود ہیں جن میں سے ایک کے بارے میں اجودھیا کے لوگ کہتے ہیں کہ یہی شیخ جمال اولیار کا مدفن ہے[٦٢] واللہ اعلم، صاحب گم گشتہ حالات اجودھیا و مرتب شہر الاولیا دونوں نے مزار جمال اولیا، کے عنوان سے اوپر کی تفصیلات تحریر کی ہیں، لیکن یہی حضرات دوبارہ اپنی کتابوں میں مزار جمال گوجری کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں: "شاہ مظفر کی مسجد سے دکھن جانب حضرت شاہ جمال گوجری کا مزار ہے، گم گشتہ ص ۴۹ و شہر اولیا ص ۲۵۲۔ جبکہ جمال اولیار اور جمال گوجری دونوں ایک ہی بزرگ ہیں جیسا کہ خود صاحب گم گشتہ کی بیان کردہ تفصیلات سے بھی ظاہر ہے ان دونوں حضرات کی یہ تحریریں دیکھ کر بیساختہ نوکِ قلم پر غالب کا یہ مصرعہ آگیا۔ " یا الٰہی یا ماجرا کیا ہے"

صاحب گم گشتہ نے شیخ جمال کے چار خلفار کا نام ذکر کیا ہے۔ مولانا کمال الدین جو شیخ جمال کے برادر خرد تھے، ان کا مزار شیخ جمال کے مزار کے متصل ہے، شاہ جانی شاہ درویش ان دونوں بزرگوں کا مرقد انترولہ ضلع گونڈہ میں ہے، اور چوتھے مولانا عبد الکریم اودھی جن کا مقبرہ محلہ قضیانہ اجودھیا میں ہے، مزار کے گرد ریختہ چہار دیواری تھی مگر عرصہ ہوا اسی محلہ کے ایک عاقبت فراموش نے (اس دعویٰ سے کہ میرے دادا نے ان دیواروں کو تعمیر کیا تھا) انھیں توڑ کر ساری اینٹیں فروخت کر دیں۔[٦٣]

" بیچ کھاتے جو اسلاف کے مدفن تم ہو "

(۱۸)

سیّد سلطان موسیٰ عاشقان

سید سلطان موسیٰ عاشقان، شیخ حاجی صدر الدین چراغ ہند ظفر آبادی متوفی ۸۹۵ھ

٦٢۔ گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۲ و شہر اولیا ص ۲۱۵۔ ٦٣۔ ایضاً ص ۱۲۔

کے مرید و خلیفہ تھے انھیں کے ہمراہ ملتان سے ظفر آباد (جون پور) آئے اور پھر یہاں سے شیخ کے حکم سے اجودھیا میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اجودھیا میں جس جگہ آپ کی رہائش تھی وہ محلہ سید واڑہ کے نام سے مشہور رہے۔ افسوس کہ سید عاشقان کے حالات دستیاب نہ ہو سکے، صاحب تاریخ شیراز ہند نے بحوالہ مرآۃ الاسرار جو کچھ لکھا ہے انھیں کے الفاظ میں وہ تفصیلات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

"آپ درویش، اہل دل، اور تنہائی پسند تھے حضرت مخدوم چراغ ہند سے بیعت تھے اور آپ ہی کے ہمراہ بسلسلۂ جہاد در دعوت و تبلیغ ظفر آباد تشریف لائے تھے، ریاضت و مجاہدات میں محنت شاقہ برداشت فرمائی تھی جب آپ کو مقام قطبیت حاصل ہو گیا تو بحکم پیر و مرشد ولایت ملک اودھ آپ کو عطا کی گئی، آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ لباس میں محض ستر عورت کا اہتمام کرتے زیادہ تر ننگے سر رہتے تھے، کبھی کبھی جذب اور وجد کی کیفیت طاری رہتی، ہجوم کو ناپسند کرتے اور تنہائی سے وحشت ہوتی صدہا فقراء مساکین آپ کی خانقاہ میں رہتے تھے، لنگر خانہ جاری تھا۔"[۴۲]

گم گشتہ حالات اجودھیا میں تاریخ وفات ۸ صفر لکھی ہے مگر سن ندارد ہے پہلے عرس بھی ہوتا تھا، سید عاشقان کے تین صاحبزادے تھے ایک صاحبزادہ کی اولاد قصبہ سیدن پور ردولی میں اب بھی موجود ہے دوسرے صاحبزادے ملہا پور متصل موضع کلاں پور ضلع جون پور میں سکونت اختیار کر لی تھی ان کی اولاد بھی اب تک اس موضع میں آباد ہے۔ بڑے صاحبزادے جو والد بزرگوار کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اجودھیا ہی میں مقیم رہے، ان کے سلسلۂ نسب سے ایک بزرگ سید سلطان علی عرف سید سلطان بخش تھے جو نہایت متوکل اور صبر و رضا

---

[۴۲] تاریخ شیراز ہند، ص ۹۹۱ از سید اقبال جون پوری طبع قدیم۔

کے مالک تھے اکثر خانہ نشین رہتے تھے، اگر کبھی گھر سے باہر نکلتے تو اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جاتے ۵، سال کی عمر میں ۱۲۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے آباو اجداد کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔[65]

شہر اولیاء میں شیخ عاشقان کے مزار کی نشاندہی اور اس کی موجودہ کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"گوکل پھول مندر کے پاس سے ایک کچا راستہ دکھن سمت گیا ہے جو آگے جاکر فیض آباد اجودھیا روڈ کے سامنے ختم ہوجاتا ہے، اس کچے راستے پر دکھن جانب تقریباً سو سوا سو میٹر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ ایک قطعہ اراضی نظر آئے گی جس میں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں اسی قطعۂ اراضی میں عام راستہ سے ۲۰، ۱۵ قدم ہٹ کر قدرے اونچے ایک چبوترے پر چند دوسری قبروں کے ساتھ سید سلطان موسی عاشقان صاحب کا مزار ہے مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباڑ کا انبار ہے"[66]

فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۹)

سید صدر الدین اودھی

سید صدر الدین اودھی زبردست عالم دین، بلند پایہ شیخ اور صاحب کشف وکرامات ولی تھے، عشق ومحبت زہد وتقویٰ آپ کی زندگی کا شعار تھا، حضرت مخدوم سید محمد گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ کے اجل خلفاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے نویں صدی ہجری کے نصف اول میں جن مشائخ وعلماء نے دعوت وارشاد کی خدمت نمایاں طور

---

[65] گم گشتہ، ص ۵۰۔ [66] شہر اولیاء ص ۲۶۵۔ ڈاکٹر دبیر فیض آبادی

پرانجام دی ہے ان میں مولانا سید صدرالدین اودھی بطور خاص قابل ذکر ہیں، اللہ کے بندوں کو آپ کے فیوض ظاہری و باطنی سے بہت فائدہ پہنچا، ۱۵ ربیع الاول ۸۶۰ھ کو آپ کا وصال ہوا، مدفن اجودھیا میں ہے۔[٦٦]

(۲۰)

قاضی شہابُ الدین اودھی

قاضی شہاب الدین مداری اودھی الملقب بہ پرکالۂ آتش، قاضی قدوۃ الدین اسرائیلی کی اولاد میں تھے، علوم دینیہ بالخصوص فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور اودھ کے قاضی تھے، ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ بدیع الدین مدار متوفی ۸۴۰ھ جس وقت کالپی سے جونپور جارہے تھے اسی سفر میں قاضی شہاب الدین ان کی زیارت سے مشرف ہوئے اور پہلی ملاقات ہی میں شیخ مدار سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیعت ہو کر ان کے حلقۂ خدام میں شامل ہو گئے[٦٨]

پھر پیر و مرشد کی محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ علمی مشغلہ ترک ہو گیا، تمام کتابوں کو دریا برد کر دیا، اور منصب قضا سے بھی دست بردار ہو گئے، شیخ مدار کی خدمت یا ذکر و مراقبہ بس یہی زندگی کا مشغلہ رہ گیا[٦٩] شیخ مدار سے اس درجہ تعلق ہو گیا تھا کہ سفر و حضر کسی بھی وقت ان کی صحبت سے جدائی گوارہ نہیں تھی، شیخ مدار کو بھی ان سے انس خاص تھا اور زیادہ تر خدمت انھیں سے لیتے تھے چنانچہ شیخ مینا لکھنوی متوفی ۸۷۰ھ کو شاہ مدار نے اپنا مصلی قاضی شہاب الدین پرکالۂ آتش ہی کے ذریعہ سے بھیجا تھا[٧٠]

---

[٦٦] تذکرۃ العابدین، ص ۱۰۲-۱۰۳۔ مولوی نذیر احمد دیوبندی۔ [٦٨] انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، ص ۹٦

[٦٩] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۷۰، ۸۰۔ [٧٠] انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، ص ۹٦۔

الحاصل پیر و مرشد کی توجہ خاص سے درجہ تکمیل کو پہونچ کر خلافت سے مشرف ہوئے، شیخ مدار کے کل ستر خلفاء تھے جن میں قاضی سید اجمل بہرائچی، مولانا حسام الدین سلامتی جون پوری، مولانا محمد جہندہ بدایونی، قاضی محمود کنتوری اور شیخ شہاب الدین پرکالۂ آتش اجل خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔[1]

پرکالۂ آتش لقب سے شہرت کے متعلق مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں لقبہ الناس لذکائہ پرکالۂ آتش" ان کے ذہن ثاقب کی بنا پر لوگوں نے انھیں پرکالۂ آتش کا لقب دیدیا تھا۔[2] بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "حرارتِ شوق الہٰی چناں غالب می بود کہ از آتش انفاس خود مرغ می پخت واز کثرت جلال خلق اورا پرکالۂ آتش می گفت"۔ عشق الہٰی کی حرارت اتنی تیز تھی کہ سانسوں کی گرمی سے چڑیا پک جاتی تھی اور کثرتِ جلال کی وجہ سے لوگ انھیں پرکالۂ آتش کہتے تھے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سن وفات معلوم نہ ہوسکا۔ ان کے شیخ و مرشد مخدوم مدار کی وفات ۸۴۰ھ میں ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کی وفات نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی ہوگی۔ مقبرہ موضع جملائی میں ہے جسے اب بڑا گاؤں کہتے ہیں جو اجودھیا سے ۲۰ ر ۲۵ کلومیٹر بر جانب مغرب واقع ہے اور معمولی درجے کا ریلوے اسٹیشن ہے جس پر صرف پسنجر گاڑیاں رکتی ہیں۔

شیخ بدیع الدین مدار کے اجودھیا میں ایک خلیفہ اور بھی تھے جو شیخ جودھن مداری اودھی کے نام سے مشہور تھے، صاحب انتصاح نے شیخ مدار کے خلفاء کی فہرست میں لکھا ہے" وحضرت شاہ جودھن کہ در شہر اودھ مسکن گرفتہ"، اور شاہ جودھن جو شہر اجودھیا میں مدفون ہیں۔ لیکن ان کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے

---

[1] تذکرۃ المتقین ج ۲ ص ۵۹ مع زیادۃ۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۰۔

اور نہ مقبرہ کی نشاندہی ہوسکی کہ کس محلے میں تھا، اجودھیا میں شاہ مدار نام سے ایک محلہ ہے ممکن ہے ان کا قیام اسی جگہ رہا ہو جس کی مناسبت سے یہ نام پڑ گیا ہو۔

(۲۱)

شیخ میاں بن حکیم اودھی

شیخ میاں بن حکیم اودھی کے تفصیلی حالات سے سردست واقفیت نہیں ہوسکی، تذکرۃ العابدین میں آپ کے متعلق کل چار سطریں ہیں جو بلفظہٖ یہ ہیں

"شیخ میاں بن حکیم اودھی قدس العزیز، آپ خلیفۂ اعظم حضرت سید صدرالدین اودھی کے اور پیر حضرت درویش محمد بن قاسم اودھی (مرشد) شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ہیں، آپ قطب الاقطاب خوارق و مظہر کرامات تھے آپ سے بڑا فیض ہوا اور تمام مخلوق آپ کی مطیع و منقاد تھی اور عمر شریف آپ کی ڈیڑھ سو سال کی ہوئی، وفات آپ کی جمادی الاخری ۸۸۹ھ یا ۹۰۱ھ میں ہوئی مزار اودھ میں ہے"[۴۳]

(۲۲)

شیخ محمد درویش اودھی

آپ کا نام نامی محمد اور لقب درویش ہے، والد ماجد کا اسم گرامی قاسم بن برہان الدین اودھی ہے، صاحب نزہتہ نے آپ کے تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے: "الشیخ الصالح الفقیہ محمد بن قاسم بن برھان الدین اودھی احد المشائخ المشھورین": شیخ صالح، فقیہ محمد بن قاسم بن برہان الدین اودھی مشہور

۴۳۔ تذکرۃ العابدین۔ ص ۱۰۴۔

مشائخ میں سے تھے تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۶ میں شیخ درویش بن محمد قاسم درج ہے جو صحیح نہیں ہے، احد المشائخ المشہورین میں ہونے کے باوجود آپ کا تفصیلی تذکرہ دستیاب نہیں ہے، خود نزہہ میں صرف چار یا پانچ سطریں آپ کے بارے میں ہے، اسی طرح شیخ لیسین بنارسی متوفی ۱۰۶۱ھ نے مناقب العارفین میں شیخ محمد بن عیسٰی بن تاج الدین جونپوری متوفی ۹۰۷ھ کے خلفار کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ درویش کا ذکر کیا ہے مگر درج ذیل چند جملوں کے علاوہ کچھ نہیں لکھا ہے۔

"واز جملہ خلفار حضرت مخدوم درویش قاسم اودھی است بسیار بزرگ بود شیخ عبدالقدوس گنگوھی را از ایشاں جامۂ خلافت رسید" [۴]

(اور منجملہ خلفار کے حضرت مخدوم درویش بن قاسم اودھی ہیں، بہت بڑے بزرگ تھے، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ان سے جامۂ خلافت ملا ہے۔)

تذکرۃ العابدین میں یہ چند سطریں ہیں: "آپ خلیفہ شیخ سعد اللہ اودھی کے اور پیر حضرت عبدالقدوس گنگوھی کے ہیں آپ بہت بڑے عالم بعلوم ظاہری و باطنی و مقبول و عاشق خدا تھے، آپ نے اپنی تمام عمر ریاضت و مجاہدہ میں صرف کی اور جا بجا مشائخ کی خدمت میں گئے اور کئی طریق سے سلسلۂ طریقت حاصل کیا اور مخلوق خدا کو فیض یاب کیا" [۵]

صاحب تذکرۃ العابدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ درویش کو اپنے عہد کے بہت سے مشائخ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، راقم الحروف کو تلاش و جستجو کے بعد چھ ایسے مشائخ کا علم ہوا جن سے آپ نے اخذ فیض کیا اور خلافت پائی تفصیل اس طرح ہے (۱) اپنے والد محترم شیخ قاسم اودھی (۲) شیخ سعد الدین اودھی (۳) شیخ محمد بن عیسٰی تاج جونپوری، یہ تینوں بزرگ شیخ فتح اللہ اودھی

---

[۴] مناقب العارفین قلمی، ص ۱۱۵ - [۵] تذکرۃ العابدین، ص ۱۰۳ -

کے مرید و خلیفہ تھے، ان تینوں مشائخ سے واسطہ کے بغیر براہ راست۔ (۴) شیخ فتح اللہ سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی، چنانچہ مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں "قال المندوی فی گلزار ابرار انہ اخذ الطریقۃ الجشتیۃ عن والدہ وعن الشیخ سعد الدین اودھی کلاھما عن الشیخ فتح اللہ، واخذ عن الشیخ فتح اللہ بلا واسطۃ[۱]"

صاحب گلزار ابرار کا بیان ہے کہ شیخ درویش نے طریقۂ چشتیہ اپنے والد اور شیخ سعد الدین اودھی خلفائے شیخ فتح اللہ سے حاصل کیا اور خود شیخ فتح اللہ سے بغیر واسطہ کے بھی اخذ فیض کیا (۵) شیخ میاں حکیم اودھی خلیفہ سید صدر الدین اودھی سلسلۂ چشتیہ کے ان پانچوں مشائخ کے علاوہ سلسلۂ مداریہ وسہروردیہ میں (۶) شیخ بدھن بہرائچی خلیفہ شیخ اجمل بہرائچی سے بھی خلافت یافتہ تھے، اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ، ان تمام سلسلوں میں شیخ درویش کے مجاز و خلیفہ تھے۔ مناقب العارفین میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی شیخ درویش کی خدمت میں حاضری اور پھر شیخ سے ان کی گرویدگی کا بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

پہلے پہل جب مولانا عبدالقدوس شیخ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو گدڑی پوش تھے، شیخ نے انھیں اس لباس میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو اس لباس میں دیکھ کر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ درویش جا رہا ہے تو یہ بات آپ کے کانوں تک پہونچےگی یا نہیں؟ مولانا نے جواب دیا، ہاں پہونچے گی! شیخ نے فرمایا کانوں سے گذر کر دل تک جائے گی؟ مولانا نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا، شیخ نے پھر سوال کیا کہ دل اس بات کی طرف متوجہ ہو گا یا نہیں؟ مولانا نے عرض کیا ہاں متوجہ ہو گا، شیخ

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۳، ص ۱۴۵-۱۴۶۔

درویش نے یہ سنکر فرمایا۔ "چرا روشے اختیار باید کرد کہ مشغولی از دست بر د د" ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی وجہ سے خدا کی یاد سے دل غافل ہوجائے"۔

شیخ کی اس لطیف تنبیہ سے مولانا عبدالقدوس گنگوہی اس درجہ متأثر ہوئے کہ انھیں کی صحبت میں رہ پڑے تا آنکہ شیخ درویش نے انھیں جامۂ خلافت دیکر رخصت کیا۔ [۵۵]

اور فن تصوف میں اپنی تصنیف "آداب السالکین"

شیخ درویش کی تصنیف آداب السالکین کا ذکر مولانا عبدالحی حسنی نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں لہ کتاب آداب السالکین کتاب مفید فی السلوک" شیخ درویش کی فن سلوک میں آداب السالکین" مفید کتاب ہے، شیخ فتح اللہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں" اخذ عنہ محمد بن قاسم اودھی صاحب آداب السالکین ان سے اخذ سلسلہ کیا محمد بن قاسم آداب السالکین کے مصنف نے [۵۶]

علاوہ ازیں اپنی مشہور تصنیف" الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" میں بھی آداب السالکین کو شیخ محمد درویش کی تصنیف بتایا ہے [۵۷] شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی شیخ فتح اللہ اودھی کے تذکرہ میں ضمناً آداب السالکین کا ذکر کیا ہے اور نصف صفحہ سے زائد اس کا اقتباس بھی دیا ہے، لیکن کتاب کی نسبت شیخ درویش کے بجائے ان کے والد شیخ قاسم کی طرف کی ہے، لکھتے ہیں "شیخ قاسم اودھی دہلوی از مریدان اوست رسالہ دارد مسمیٰ بہ آداب السالکین [۵۸] شیخ قاسم اودھی دہلوی ان کے (شیخ فتح اللہ) کے مریدوں میں سے ہیں جن کا آداب السالکین نامی ایک رسالہ ہے۔

یوم پنجشنبہ ۱۶ محرم ۸۹۶ھ کو شیخ درویش کا وصال ہوا، محلہ چراغ دہلی اجودھیا د عالم گنج کٹرا) میں شیخ فتح اللہ کے حظیرہ میں مشرقی دیوار کے متصل اپنے والد

---

[۵۴] مناقب العارفین ص ۱۱۵۔ [۵۵] نزہتہ ج ۳ ص ۱۴۶ [۵۶] ایضاً ج ۳ ص ۱۳۔ [۵۷] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اردو ترجمہ ص ۲۷۳۔ [۵۸] اخبار الاخیار ص ۱۷۲۔

بزرگوار کے پائینتیں آسودہ خواب ہیں۔[۱]

منشی محب اللہ فرید آبادی سپرنٹنڈنٹ نے مولانا محمد علی خلیفہ مولانا سید امیر علی شہید کے حکم سے شیخ قاسم و شیخ محمد درویش کے مزاروں کی مرمت اب سے تقریباً ۷۰۔۸۰ برس پہلے کرادی تھی اس لئے دونوں قبریں ابھی درست حال میں ہیں[۲] مگر یہ آج سے پچاس سال پہلے کی اطلاع ہے، اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ نشانات محفوظ ہیں یا نہیں۔

(۲۳)

شیخ علاءالدین حسینی اودھی

مولانا سید علاءالدین اودھی سید شریف احمد ماہرو بغدادی کی اولاد سے اور حسینی سید تھے، علم وصلاح سے متصف صاحب ذوق وحال بزرگ تھے۔ ہندوستانی سنگیت اور موسیقی کے ماہر تھے، شیخ عبدالسلام بن سعدالدین بجنوری کے مرید وخلیفہ تھے، فارسی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے، نمونہ کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج ہیں۔

ندانم آں گل خنداں چہ رنگ و بو دارد — کہ مرغ ہر چمنے گفت گوے او دارد

بجستجوے نیابد کسے مراد دلے — کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

نشاط بادہ پرستاں بہ منتہا برسید — ہنوز ساقی ما بادہ در سبو دارد

حدیث عشق تو تنہا نہ من ہمی گویم — کہ ہر کہ ہست ازیں گونہ گفتگو دارد

متاع دل بکف دلبرے بدہ تو علا — کہ ایں متاع گرانمایہ او نکو دارد

آپ کے خلفاء میں سید علی تلہری اور صاحبزادے ماہ رو بطور خاص شہرت

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۳۔ [۲] گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۳۵۔

کے مالک ہوئے، باختلاف روایت ۹۶۸ھ یا ۹۷۰ھ میں وفات پائی۔[۸۳]
اجودھیا کے مشہور قبرستان "خرد مکہ" میں محوِ خوابِ راحت ہیں، اسی میں آپ کے صاحبزادے سید ماہ رو اور دیگر اہل خاندان و متعلقین کے مزارات ہیں، سید علاء الدین کے مزار کے سرہانے ایک سیاہ پتھر نصب تھا مگر ۲۰/۰ ، سال کا عرصہ ہوا کچھ نامعلوم افراد رات کو وہ پتھر وہاں سے اکھاڑ لے گئے اور اسی کے ساتھ بہت سی قبریں بھی کھود ڈالیں، بعد میں بذریعہ پولیس تحقیقات کرائی گئی مگر کچھ سراغ نہ ملا کہ کن لوگوں کی یہ حرکت تھی اور کن اغراض کے تحت ایسی مذموم حرکت کی گئی۔[۸۴]

"خرد مکہ" قبرستان پر مودین کٹیا کے پورب ۳۰ ر ۴۰ میٹر کے فاصلے پر ہے اس مشہور مقبرہ (جس میں بڑے بڑے علماء و اولیاء، عباد و زہاد مدفون ہیں) کی ناگفتہ بہ حالت کو ڈاکٹر دبیران الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ہے، جس میں خودرو جنگلی پودے اگے ہوئے ہیں، کبھی یہ باغ ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا کیونکہ قدیم ترین چہار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں، باغ کا یہی احاطہ 'خرد مکہ' کہلاتا چلا آرہا ہے، انیسویں صدی کے آخر تک اس میں ہزاروں پختہ و خام قبریں موجود تھیں۔ جس زمانہ میں "راجہ درشن سنگھ" نے نالہ کھدوایا تو بہت سی قبریں اس نالہ میں آکر تلف ہوگئیں اسکے علاوہ بہت سی قبریں فیض آباد روڈ بننے کے وقت سڑک اور فٹ پاتھ میں آکر تلف ہوگئیں۔[۸۵]

---

[۸۳] نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۲۳۲۔ [۸۴] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۱۷۔
[۸۵] شہر اولیاء۔ ص ۲۰۷/۲۰۸۔ مع اختصار۔

(۲۴)

عاشق شاہ اودھی

شیخ غلام علی المعروف بہ عاشق شاہ اجودھیا کے علمائے عظام و مشائخ کبار میں تھے ابتدا میں علماء کی روش پر درس و تدریس میں مشغول رہے بعد میں جاذب حقیقی نے اپنی طرف کھینچا تو علمی مشغلہ سے دل اچاٹ ہو گیا اور مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے، گھومتے پھرتے شیخ عبدالباسط الہ آبادی متوفی ۱۱۹۶ھ کی خدمت میں پہونچ گئے، شیخ عبدالباسط پر ان کی نظر جیسے ہی پڑی ہوش و حواس کھو بیٹھے اور وارفتگی کے عالم میں بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے، بعد میں افاقہ ہوا تو شیخ الہ آبادی نے انھیں اجودھیا واپس لوٹ جانے کا حکم دیا، چنانچہ حکم کے مطابق واپس تو آگئے مگر شیخ کی نگاہ کیمیا اثر نے دل کی دنیا ہی بدل دی تھی، وطن مالوف میں سکون نہ ملا اور جملہ اسباب و مال و متاع نذر فقراء و مساکین کر کے دیوانہ وار شیخ الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور مسلسل کئی سال تک صحبت میں رہ کر ریاضت شاقہ میں مشغول رہے تا آنکہ شیخ نے خلافت اور عاشق شاہ کے خطاب سے نواز کر اجودھیا رخصت کیا، کثرت ذکر کی وجہ سے جذب و سکر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس لئے مدتوں سرگشتہ اور ادھر ادھر گھومتے رہے، بالآخر اس کیفیت میں کچھ کمی آئی تو وطن عزیز واپس آئے، اور محلہ کاغذی ٹولہ کی مسجد میں فروکش ہو گئے، کسی معتقد نے مسجد کے غسل خانہ کے اوپر ایک حجرہ تعمیر کرا دیا تھا اسی حجرہ میں زندگی کے بقیہ دن گذار دئے، مرید و طالبین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ شیرازی کا درس بھی دیتے تھے، نواب آصف الدولہ کے عہد نوابی ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی محلہ

کاغذی ٹولہ میں معماروں کے امام باڑہ کے متصل آپ کی قبر ہے، اسی مناسبت سے مولوی سید محمد علی اودھی نے مصرعِ تاریخ وفات یوں کہا ہے۔

" آستانِ امام شد جائش "

۱۲۱۲ ھ

مزار کی عالی شان عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے [۵۶]

۲۵

مولانا سیّد شاہ صفدر حسین اودھی

مولانا الحاج السید الشاہ صفدر حسین بن الشاہ محمد بخش بن السید ارتضیٰ حسین اودھی اجودھیا کے علمائے متاخرین میں اپنے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور شرافت ومروّت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، آپکا قیام اکثر پایۂ تخت دہلی میں رہا جہاں شاہی کتب خانہ سے خوب خوب استفادہ کیا، علم تفسیر سے آپ کو خاص شغف تھا، چنانچہ آپ نے قرآن سے متعلق ایک کتاب بھی مرتب کی تھی جس میں آیاتِ احکام، شان نزول، نیز قرآنی سورتوں اور آیات وحروف کی تعداد اور زبر، زیر پیش وغیرہ کا شمار بڑی عرق ریزی اور تحقیق سے جمع کر دیا تھا، مرزا اسد اللہ غالبؔ کے ممدوحین کی فہرست میں آپ کا نام نامی بھی شامل ہے، دیوانِ غالب میں ایک قصیدہ آپ کی شان میں موجود ہے، آپ کو دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا، اپنے والد شاہ محمد بخش کی وفات کے بعد دہلی سے اجودھیا واپس تشریف لائے اور اپنی آبائی خانقاہ کے گدی نشین ہوئے اجودھیا کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ کسی عقیدت مند نے آپ کی دعوت کی

[۵۶] فصول مسعودیہ، ص ۱۳۴- د گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۴۸۔

جس میں آپ کے خدام کے علاوہ خانوادہ شیخ عبد الحق نوشہ ردولوی کے دو بزرگ شاہ حمید احمد و شاہ محمد احمد ردولوی بھی شریک تھے، چونکہ آپ کو بواسیر کا عارضہ تھا اس لئے آپ کے لئے الگ سے پرہیزی کھانا تیار کیا گیا تھا، لیکن باورچی نمک ڈالنا بھول گیا اور کسی نے بتقاضائے ادب کھانے کو چکھا بھی نہیں، کھانے کے وقت یہ پرہیزی کھانا آپ کے سامنے رکھا گیا، آپ نے پوری بشاشت کیساتھ کھانا تناول کیا اور کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ کھانا پھیکا ہے۔ کھانے کے بعد پتہ چلا کہ کھانے میں تو نمک تھا ہی نہیں، میزبان اس پر بہت جز بز ہوا اور آپ کی خدمت میں آکر معذرت خواہ ہوا، آپ نے اسے تسلی دی، اور فرمایا کہ تمھارا مقصد کھانا کھلانا تھا، اور میں نے کھا لیا اس لئے تمھیں رنج و غم نہیں کرنا چاہئے، مولوی عبد الکریم اودھی نے لکھا ہے کہ اس موقع پر میں بھی وہاں موجود تھا، آپ کی اس عالی ظرفی پر تمام شرکائے دعوت کو حیرت ہوئی، ۱۲۹۱ھ میں حضرت مجدد الف ثانی اور دیگر بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ کے لئے سرہند تشریف لے گئے وہیں بحالت غربت پیغام اجل آگیا، اور آپ دار فانی کو چھوڑ کر راہی ملک باقی ہو گئے [۱]

اس وقت نہ خانقاہ کے آثار باقی ہیں نہ مزارات کے، جس وقت قطعہ ارض پر لوگ مزارات اور خانقاہ کی تعیین کرتے ہیں وہ کاشت کی زمین میں تبدیل ہو چکا ہے جس پر کاشت کی جا رہی ہے۔

(۲۶)

مولانا حکیم محمد اسلم اودھی

آپ علم منقولات و معقولات دونوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص

---

[۱] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۲۱۔

فن حکمت و طبابت میں تو وحید العصر تھے، اس فن میں آپ کے کئی منظوم رسالے ہیں نواب آصف الدولہ متوفی ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء کے عہد میں اجودھیا وارد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، سیکڑوں طلبہ نے آپ سے علم طبابت حاصل کیا جن میں سید میاں مرتضیٰ مودودی اور حکیم مرزا محمد علی لکھنوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

علوم ظاہری میں کمال کے ساتھ آپ ایک مرشد کامل بھی تھے، سلسلۂ قادریہ میں آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی، وفات کے وقت آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے شیخ محمد درویشؒ اودھی کے مرقد کے قریب دفن کیا جائے، آپ کے تلامذہ و متوسلین نے حسب وصیت شاہ فتح اللہ اودھی کی قبر کے پائتیں اور شاہ درویش کی قبر کے قریب قبرستان کے احاطہ کی دیوار سے متصل دفن کیا، مولوی عبدالکریم اودھی مؤلف تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء متوفی ۱۳۰۸ھ نے لکھا ہے کہ تاریخ پارینہ کی تالیف سے چالیس سال قبل قاضی محمد علی اودھی کے لڑکوں نے تکیہ شاہ فتح کے بالکل متصل اینٹوں کے پکانے کا بھٹہ کھودا، ہر چند لوگوں نے انھیں اس سے منع کیا، لیکن انھوں نے کسی کی نہیں سنی، اس بھٹہ کی کھدائی میں تکیہ کی بہت سی قبریں تلف ہو گئیں جن میں مولوی محمد اسلم مرحوم کی قبر بھی شامل تھی، اس کے نتیجے میں بھٹہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور قاضی صاحب کے لڑکے اس طرح مصائب میں مبتلا ہوئے کہ مجبوراً اجودھیا سے کہیں اور منتقل ہو گئے، تفصیلی حالات اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

(۲۷)

شیخ عبد الحق اودھی

اجودھیا کے علمائے متاخرین میں شیخ عبدالحق اودھی علوم ظاہری و باطنی ہر ایک میں بلند مقام و مرتبہ پر فائز تھے، حسب تصریح مولوی عبدالکریم اودھی آپ

شاہ مظفر بلخی خلیفہ خاص شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کی دختری اولاد میں تھے ۔ علوم وفنون کی تکمیل بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ سے کی تھی، علم فقہ سے آپ کو کافی شغف تھا اور اس میں بڑی مہارت رکھتے تھے، نماز سے آپ کو عشق کی حدتک تعلق تھا، مرض وفات میں جب کہ ہوش وحواس درست نہیں تھے اسی عالم بے خبری میں تکیہ پر تیمم کر کے نماز کی نیت باندھ لیتے تھے، اپنے آبائی خانقاہ کے آپ سجادہ نشین تھے اور ایک کثیر جماعت نے آپ سے اخذِ فیض کیا، ۷، ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو آپ کی وفات ہوئی اور آبائی قبرستان میں اپنے بزرگوں کے جوار میں دفن کئے گئے، آپ کی وفات کے بعد خانقاہ کے سجادہ نشیں آپ کے صاحبزادے شاہ علاء الحق مقرر ہوئے اور اپنے والد کی وفات کے پانچ سال بعد ۲۲ رمضان ۱۲۷۴ھ کو یہ بھی رحلت کر گئے، اس خانقاہ کو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ کے عہد سے ۴۸۰ روپے مصارف کے لئے خزانۂ شاہی سے ملتے تھے، شاہ علاء الحق کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ احمد زماں سجادۂ مشیخت پر بیٹھے، مگر یہ بھی عالمِ شباب میں انتقال کر گئے [۵۸]

---

۵۸ گم گشتہ، ص ۲۸ و ۲۹ ۔

باب دوم

اجودھیا کی مشہور مساجد کی تاریخ

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

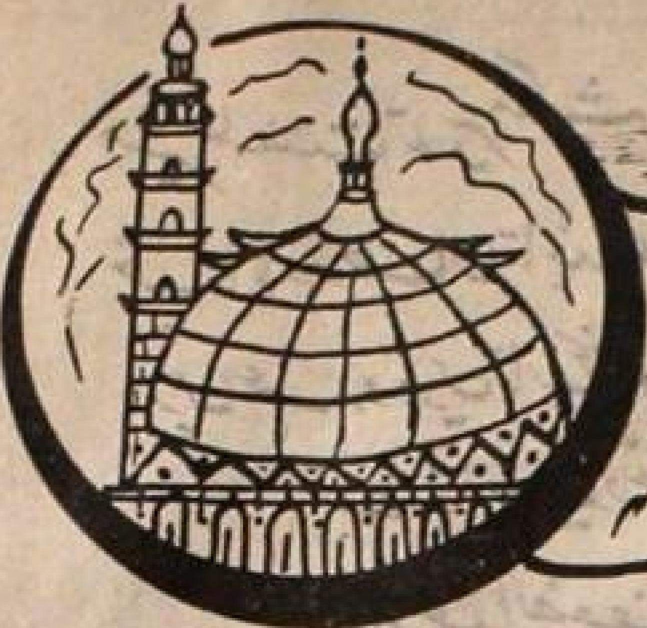

بابری مسجد

تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد بادشاہ بابر کے دور میں حاکم اودھ میر باقی اصفہانی نے ۹۳۵ھ ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے مسقف اندرونی حصہ میں تین صفیں ہیں اور ہر صف میں اندازاً ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے ہیں، اور صحن میں چار صفیں ہیں، اس طرح بیک وقت تقریباً ساڑھے آٹھ سو آدمی اس میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔

مسجد کے مسقف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر دو میٹر لمبی اور پچپن سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی کا ایک کتبہ نصب ہے، جس کی پہلی اوپری سطر میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم و بہ ثقتی" خوشنما بیلوں کے درمیان لکھا ہوا ہے اور نیچے کی تین سطروں میں یہ اشعار درج ہیں جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانئ مسجد کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بنام آنکہ او دانائے اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانے
درود مصطفٰے بعد از ستائش — کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے
فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ ہفت کشور در گرفتہ — زمیں راچوں مثال آسمانے
دراں حضرت یکے میر معظم — کہ نامش میر باقی اصفہانے

مشیر سلطنت تدبیر ملکش　　کہ زیں مسجد حصار ہست بانے
خدایا درجہاں تابندہ ماند　　کہ چتر و تخت و بخت زندگانے
دریں عہد و دریں تاریخ میموں　　کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانے

تمت ہذا التوحید و نعت و مدح وصفت نور اللہ برہانہ
بخط عبد الضعیف نحیف فتح اللہ محمد غوری

ان اشعار کا حاصل ترجمہ :-

اس ذات گرامی کے نام سے جو دانا اور سب سے بڑا ہے، اسکے بعد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود جو نبیوں کے سردار اور کائنات کے خلاصہ ہیں، بابر قلندر کی دنیا میں کامیابی کا فسانہ مشہور ہو گیا، اس نے ہفت اقلیم کو اس طرح اپنے قبضہ میں کر لیا جس طرح زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے، اس شہر میں ایک باعزت سید ہیں جن کا نام نامی میر باقی اصفہانی ہے، جو سلطنت کے مشیر اور ملک کے مدبر ہیں وہی اس مسجد کے بانی ہیں، اے خدا تو دنیا میں ان کے تاج و تخت اور زندگانی کو روشن رکھ اسی عہد اور مبارک تاریخ میں کہ نو سو پینتیس ۹۳۵ ہے لکی یہ مسجد نشانی ہے۔ یہ حمد، نعت، توصیف و تعریف مکمل ہوئی بندہ ضعیف فتح اللہ محمد غوری کے خط سے۔

فروری ۱۹۸۷ء تک یہ کتبہ اپنی جگہ پر خستہ حالت میں سہی موجود تھا، اس وقت بھی بعینہ اپنی حالت پر محفوظ ہے یا نہیں اس کا علم خدا ہی کو ہے، کیونکہ بروقت اس مسجد کے پاس سے گذرنا بھی مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے، اندر جاکر کتبہ کو دیکھنا تو بہت دور کی بات ہے، انگریز مورخ مسز بیورج نے۔ تزک بابری کے ترجمہ "دی بابر نامہ ان انگلش" کے دوسری جلد کے ضمیمہ میں بابری مسجد کے کتبات کے عنوان کے تحت ایک دوسرے کتبہ کے علاوہ (جس کا ذکر آئندہ آرہا ہے)

اس مذکورہ بالا کتبے کے تین ابتدائی اشعار نقل کئے ہیں، پانچ اشعار کو انھوں نے کیوں چھوڑ دیا بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبارت گنجلک ہونے کی وجہ سے وہ بقیہ اشعار کو پڑھ نہ سکیں اس لئے مجبوراً انھیں نقل نہیں کیا۔

اس بڑے کتبے کے علاوہ مسجد کے اندر منبر کے دونوں جانب ایک ایک کتبہ نصب تھا۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۳۴ء (۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ) کو اجودھیا میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فسادیوں نے بابری مسجد میں گھس کر توڑ پھوڑ کی تھی اور ساتھ ہی ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، بعد میں "تہور خاں ٹھیکیدار" نے منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی نقل تیار کرا کے اسی پہلی جگہ پر لگا دیا، البتہ داہنی طرف کے کتبے کی ایک نقل "سید بدر الحسن فیض آبادی" کے پاس تھی اسلئے یہ کتبہ بھی دستیاب ہو گیا۔

بائیں جانب کے کتبے میں تین اشعار ہیں، دوسرے شعر میں بانی مسجد "میر باقی" کا نام ہے، اور تیسرے شعر کے آخری کلمہ "خیر باقی" سے سن تعمیر برآمد ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی اہمیت کے پیش نظر تہور خاں نے اس کے نقل کرانے کو ترجیح دی، اس کتبہ کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش — بنائیست با کاخ گردوں ملاقی

بنا کردہ ایں مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی

بود خیر باقی و سال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

ان اشعار کا ماحصل:۔

شاہ بابر کے حکم سے جن کے قصر عدل کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے فرشتوں کے اترنے کی اس جگہ (مسجد) کی تعمیر نیک بخت امیر "میر باقی" نے کی (ہمیشہ یہ) خیر باقی رہے اور اسی دعائیہ جملہ "خیر باقی" سے اس کی تاریخ تعمیر ۹۳۵ھ ظاہر ہو رہی ہے۔

اس پورے کتبے کو مسٹر بیورج نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، البتہ ان سے کچھ لفظی چوک ہوگئی جس سے شعر کی معنویت قدرے متاثر ہوتی ہے،

منبر کی داہنی جانب کا کتبہ یہ ہے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں ۔۔۔ بنائے کہ با کاخ گردوں عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار ۔۔۔ امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چنیں بانیش ۔۔۔ چناں شہریار زمین و زماں

دنیا کے تاجدار بابر کی منشا سے جن کا عروج قصر آسماں کی برابری کررہا ہے، اس پائیدار گھر (مسجد) کی تعمیر نیک بخت امیر میر خان نے کی ہے۔ اس پائیدار گھر کی طرح اس کا بانی ہمیشہ رہے اسی طرح سے وقت کا بادشاہ (بابر) بھی باقی رہے۔

ان تینوں کتبات کی مائیکرو فلم اور فوٹو ضمیمہ فارسی و عربی ہندوستانی کتبات (۱۹۶۵ء) ناگپور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ان کتبات سے ظاہر ہے کہ میر باقی اصفہانی نے بعہد بابر ۹۳۵ھ ۱۵۲۸ء میں اس مسجد کی تعمیر کرائی ہے، اس پختہ اور مضبوط سند کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، ابتدائے تعمیر سے مسجد میں پنج وقتہ نمازیں اور جمعہ ہوتا رہا ہے، عدالتی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک اس مسجد کے امام و خطیب محمد اصغر تھے، اور ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء تک امامت کے فرائض مولوی عبدالرشید نے انجام دیئے، پھر ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء تک یہ خدمت مولوی عبدالقادر کے سپرد رہی اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء مسجد کے قرق ہونے کی تاریخ تک مولوی عبدالغفار کی اقتدا میں مسلمان اس مسجد میں نماز پنجگانہ اور جمعہ ادا کرتے تھے، یہ آخری امام ابھی حیات ہیں اور اجودھیا ہی میں رہتے ہیں، ان

سے بھی اس سلسلہ کی بعض تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔

مسجد کے مصارف کے لئے پورے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ (۶۰) روپے سالانہ سرکاری خزانہ سے ملتے تھے۔ نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی (۳۰۲/۳/۶) کردی گئی تھی۔ برطانوی اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی پھر بندوبست اول کے وقت نقد کے بجائے دو گاؤں۔ بھورن پور اور شولاپور متصل اجودھیا بطور معافی دیئے گئے۔ چنانچہ رجسٹرڈ زیر دفعہ ۳۰ میں اس وقت کے متولی ــــ جواد حسین ساکن شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد کا نام اور جائداد کی تفصیل۔ عمارت مسجد بابری مع اراضی واقع موضع بھورن پور و شولاپور تحصیل و ضلع فیض آباد درج ہے۔ ان دونوں مواضعات کی آمدنی برابر اس مسجد کے مصارف و ضروریات میں خرچ ہوتی رہی۔

علاوہ ازیں سنی وقف ایکٹ نمبر ۱۳ (سنہ ۱۹۲۰ء) کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے باقاعدہ معائنہ کرکے اس کا رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔ غرضیکہ ابتدائے تعمیر سنہ ۹۳۵ھ (۱۵۲۸ء) سے سنہ ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۹ء) تک یعنی ۴۳۴ یا ۴۲۱ سال کی طویل مدت میں تاریخی، قانونی، عرفی کسی اعتبار سے بھی اس کی حیثیت کے بارے میں کوئی اختلاف و نزاع سامنے نہیں آیا، اور بغیر کسی مزاحمت کے یہ مسجد مسلمانوں کے قبضہ اور انتظام میں رہی۔

اختلاف کی ابتداء :۔

مستند تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے سے مسلمان اجودھیا میں آباد تھے۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان پوری یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ اپنے اپنے مذہب کے مطابق مذہبی مراسم اور عبادتیں

سے پہلے کسی مذہبی بات کو لے کر یہاں کے باشندوں میں کبھی ادا کرتے تھے، ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ سے پہلے کوئی تنازعہ پیدا ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو صحیح تاریخوں اور مذہبی نوشتوں سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

لیکن جب یہاں انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوا تو اس نے اپنی منحوس ڈپلومیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت دونوں فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی غرض سے مسجد، مندر، جنم استھان وغیرہ کا قضیہ چھیڑ دیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں یہاں زبردست خوں ریزی ہوئی (جس کی تفصیل "ہنومان گڑھی مسجد" کے ذکر میں بیان ہوگی) اس دن سے یہ اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، اور نوبت باینجا رسید۔

"جنم استھان" افسانے کا پلاٹ اس طرح تیار کیا گیا کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے سکھا پڑھا کر اس سے "رام جنم استھان" اور "سیتا کی رسوئی" کی جگہ معلوم کی گئی، اس نے زائچہ کھینچ کر بتایا کہ جنم استھان و سیتا کی رسوئی بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھر جذباتی قسم کے ہندوؤں کو اکسایا گیا کہ وہ ان دونوں پوتر استھانوں کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ "نقی علی خاں" جو اگرچہ نواب واجد علی شاہ کا خسر اور وزیر تھا، ان دوہرے رشتوں کے باوجود "واجد علی شاہ" کے مقابلے میں درپردہ اس کی وفاداریاں انگریزوں کے ساتھ تھیں، علاوہ ازیں رشوت خوری میں بھی اپنے وقت میں طاق تھا، ان وجوہ سے اس نے اس افسانے کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں بنیادی کردار ادا کیا، عاقبت سے غافل نواب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مسجد سے باہر مگر احاطہ مسجد کے اندر جنم استھان و سیتا رسوئی کے لئے جگہ دیدی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار کے متصل سیتا رسوئی کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی طرف جنم استھان کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی۔ جہاں پوجا پاٹ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا، حالانکہ جس وقت

جنم استھان کا یہ افسانہ گھڑا گیا اس وقت۔ "الگزینڈر کیننگھم" کی تحقیق کے مطابق لکشمن گھاٹ سے ۴/۳ میل کے فاصلہ پر بیچ شہر میں "جنم استھان" کا مندر موجود تھا۔[۱]

اس موقع پر یہ بھی انتظام کیا گیا کہ لوہے کی سلاخوں سے صحن مسجد کو گھیر دیا گیا جو اب تک کھلا ہوا تھا، گویا مسجد اور اس فرضی جنم استھان کے درمیان حد فاصل قائم کر کے مسجد کی حفاظت کی طرف سے اطمینان کر لیا گیا، یہ ہے جنم استھان کی حقیقت[۲] جس کی بنیاد پر ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈال دیا گیا، سچ کہا ہے کہنے والے نے،

ع   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

غرضیکہ مسجد و مندر کے نام پر ۱۸۵۵ء میں دونوں فرقوں کے درمیان خونریز تصادم کرا دینے کے بعد "جنم استھان" کا یہ قضیہ کھڑا کیا گیا جس سے اجودھیا کی یک جہتی و پرامن فضا میں نفرت و عداوت کا غبار اٹھنا فطری امر تھا، لیکن شاطر سامراجیوں کی اس مؤثر حکمت عملی کے باوجود ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر بابری مسجد اور جنم استھان مندر کا قضیہ جو مسلم ہندو اتحاد کی راہ میں سب سے بڑا روڑا تھا آپسی گفت و شنید سے طے کر لیا گیا، جس کی تفصیل جناب رئیس منظر صاحب نے فیض آباد گزیٹر کے حوالہ سے یوں بیان کی ہے۔

مسجد مندر تنازعہ کا مصالحانہ حل اور سامراجی طاقت کا منفی رویہ

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے دانشمندی سے کام لے کر اس تنازعے کو پرامن طریقے سے حل کر لیا تھا، دونوں فریق اس حل سے مطمئن تھے، مگر اس وقت ہندوستان انگریزوں کا محکوم تھا۔ انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو اپنے اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ

---

[۱] بابری مسجد تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں، ص ۴۲۔ [۲] قیصر التواریخ ج ۲ ص ۱۱۸

سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے دونوں فرقوں کے اس معاہدے کو چلنے نہیں دیا۔ بات ۱۸۵۷ء کی ہے، یہ وہ سال ہے جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کا بگل بجایا تھا۔ اس واقعہ کو صرف ایک سو تینتیس ۱۳۳ سال ہی ہوئے ہیں۔

اجودھیا فیض آباد میں ہے اور رام جنم بھومی اجودھیا میں ہے، فیض آباد ضلع گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اجودھیا کے مقامی مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا رام چرن داس نے رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعے کا حل تلاش کرنے کی غرض سے دونوں فریقوں کی طرف سے معاہدہ کیا کہ جنم بھومی کی مخصوص متنازعہ اراضی ہندوؤں کو سونپ دی جائے، اس کے عوض بابا رام چرن داس نے ہندوؤں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ پوری عمارت پر قابض ہونے کا مطالبہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں تاکہ مسلمانوں کو مسجد نہ ہٹانا پڑے۔

اس وقت بھی رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعے نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر ہندو اور مسلمان اس سوال پر لڑ پڑے تو آزادی کی جو لڑائی چل رہی ہے اس کو سخت صدمہ پہنچیگا اس خطرے کو ٹالنے کے لئے ہی اجودھیا کے امیر علی اور بابا چرن داس نے بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیا، کھنچی ہوئی تلواریں میانوں میں واپس چلی گئیں، اس معاہدے نے ہندوؤں کو یہ اختیار دیا کہ وہ رام جنم استھان پر کسی روک ٹوک کے بغیر پوجا کر سکیں، مسلمان خوش تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ ان کا برادرانہ تعلق برقرار رہیگا انھیں مسجد کو اس کی جگہ سے ہٹانا نہیں پڑے گا، اس طور سے ہندو اور مسلمان آپس میں الجھنے کے بجائے اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف اپنی پوری طاقت صرف کرنے کے لئے آزاد ہو گئے۔

لیکن انگریزوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ معاہدہ پسند نہ آیا، انھوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی کو رام جنم بھومی کے نزدیک ریت کے ایک ٹیلے پر املی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی، دونوں کو ایک ہی مقام پر پھانسی دینے کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں کوئی ایسی کوشش نہ کرے جیسی ان محبان وطن نے کی تھی۔

اودھ کی حکومت کمزور تھی اور وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے اس ظالمانہ فعل کا جواب دینے کی ہمت نہ تھی یہ ستم رسیدہ لوگ خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔

انگریزوں نے امیر علی اور بابا رام چرنداس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اسے مسترد کر کے رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعے کو ازسرنو زندہ کر دیا صرف یہی نہیں انھوں نے اودھ کو اپنی حکومت میں شامل کر لینے کے بعد رام جنم بھومی اور بابری مسجد کی عمارت کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی جس کے ایک طرف رہا رام چبوترے والا حصہ اور دوسری طرف مسلمانوں کیلئے نماز پڑھنے کا حصہ دونوں کے راستے بھی الگ الگ بنا دیئے، مسجد میں شمال کی طرف سے داخلے پر پابندی لگا دی گئی انگریز افسروں نے ایکطرف ہندوؤں کو پوری عمارت پر دعویٰ کرنے کیلئے اکسایا تو دوسری طرف مسلمانوں سے کہا کہ وہ مسجد کا بٹوارہ منظور کریں، اس طرح ظالم فرنگیوں کی سیاسی حکمت عملی نے دونوں فرقوں کے درمیان مستقل فساد کے بیج بودیئے[1]

اس طرح اس مصالحانہ کوشش کے پامال کر دینے کے بعد ۱۸۵۸ء میں "جنم استھان" کے قضیہ کو پھر سے زندہ کیا گیا، اور کچھ بیراگیوں اور "بنی غلام" تھانیدار اجودھیا کی سازش سے فرضی جنم استھان کی اس پرتی اور خالی جگہ پر ایک بالشت چبوترہ بنا لیا گیا، اور اس خلاف قانون بیجا مداخلت پر عدالت سے چارہ جوئی کی گئی، تو تھانیدار کو معطل اور ان بیراگیوں پر جرمانہ عائد کیا گیا۔ مگر اس چبوترہ کو اپنی فاسد اغراض کے تحت باقی رکھا گیا، اس واقعہ کے چند مہینوں کے بعد ایک سرکاری ملازم

---

[1] روزنامہ قومی آواز۔ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ء جلد ۵۱ شمارہ ۲۸۹۔

بیگ سنگھ نے چند بیراگیوں کو لے کر اندھیری رات میں مسجد میں گھس کر محراب مسجد
کے پاس ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا اور دیوار مسجد پر جا بجا کوئلے سے رام رام لکھ دیا
اور اس نزاعی چبوترہ کو مزید اونچا کر کے اس پر ایک مورتی نصب کر دی علاوہ ازیں
چبوترہ سے متصل ہوم کا ایک گڑھا بنا لیا صبح کو جب مسلمان مسجد میں آئے اور ان بیجا
حرکتوں کو دیکھا تو اس وقت کے بابری مسجد کے خطیب و مؤذن مولوی محمد اصغر نے
درج ذیل درخواست عدالت میں پیش کی۔

نقل درخواست محمد اصغر خطیب و مؤذن مورخہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

مجریہ نمبر ۸۸۴ محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا

عرض غریب پرور سلامت۔ بجناب عالی بالتماس جدید عرض ہوتا ہے کہ مسمی
بیگ سنگھ ..... ملازم سرکار دولت مدار با اغوائے بیراگیان جنم استھان
بانی فساد ہے بیچ مسجد بابری واقع اودھ قریب محراب و منبر ایک
چبوترہ مٹی کا بلندی چار انگشت .... معروفیات ہے
چبوترہ مسجد اندر کٹہرہ اور چبوترہ کے جدید ..... بلندی تقریباً
سوا گز کا تیار کر کے نشان و تصویرات استعداد کیا ہے۔ برابر اس کے ایک
گڑھا کھود کر منڈیر پختہ کروا کر اس کی تیاری کر کے، آتش روشن کی ہے، بوجہ
ہوم میں مصروف ہیں، جا بجا مسجد میں کوئلے سے رام رام لکھا ہے۔ عادل
رعایا یہ مقام انصاف کا ہے کہ صریح ظلم و زیادتی اہل ہنود اہل اسلام پر کرتے
ہیں و حضور ملک کو تحقیق یقین کرتے ہیں ....

جناب عالی! مقام غور کا ہے، مسجد مقام عبادات مسلمانان ہے کہ
بخلاف اس کے کچھ ہنود کی بساط تو ہم ہے، قبل عملداری سرکار کے مقام جنم استھان
کا کل صد ہا برس سے پریشان پڑا رہتا تھا، اہل ہنود پوجا کرتے تھے، چبوترہ بلا اذن

یعنی غلام ہم تھانہ دار اودھ کے بیراگیوں نے شبا شب میں ....

یہ بلندی ایک بالشت تیار کرا لیا اس وقت جناب ڈپٹی کمشنر بہادر کے
بموجب حکم جناب کمشنر نے تھانہ دار کو موقوف کیا اور بیراگی پر جرمانہ بھی کی
ہوا اب فی الحال اس چبوترہ کو ہی تخمیناً سوا گز تیار کرا لیا ہے اس
صورت میں صریح زیادتی ثابت ہے لہذا امیدوار ہوں کہ بنام مرتضیٰ
خان کوتوال شہر صدور حکم ہو وے کہ کوتوال بچشم خود معاینہ کر کے
عمارات جدیدہ کو کھدوا ڈالیں و مرمان مومنو کو بیرون مسجد کے کر دیں واجب
جان کر عرض کیا

بندہ محمد اصغر خطیب و موذن مسجد بابری واقع اودھ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء

(نوٹ) اصل کاغذ نہایت شکستہ ہے اور جابجا حروف اڑ گئے ہیں اس لئے ان جگہوں پر
نقطے لگا دیئے گئے ہیں۔

اس درخواست پر اندر کے چبوترہ کو عدالت نے کھدوا دیا نیز حدود مسجد سے
باہر احاطے کے اندر والے چبوترہ پر جو زیادتی کی گئی تھی اسے بھی توڑ دیا ہوم کے
گڑھے کو پاٹ دیا گیا اور مورتی بھی وہاں سے ہٹا دی گئی۔[1]

اس درخواست اور اس کے فیصلے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیراگیوں
مسلمانوں اور سرکاری عدالت سب کے نزدیک جنم استھان کی جگہ خارج مسجد
احاطے کے اندر معلوم و متعین تھی جھگڑا تھا تو صرف اس متعینہ جگہ میں کسی قسم کے
اضافے اور ترمیم کا تھا مسجد سب کے نزدیک بے نزاع مسلم طور پر مسجد تھی۔

اس مقدمہ کے بعد تقریباً بارہ سال تک بابری مسجد کے خطیب اور جنم
استھان کے پجاری کے درمیان کسی قسم کے نزاع یا مقدمہ بازی کا پتہ نہیں چلتا

---

[1] بابری مسجد پس منظر و پیش منظر ص ۲۹، ۳۰۔

البتہ بابری مسجد سے متصل قاضی قدوہ کے قبرستان میں ایک کٹیا بنا لینے کے سلسلے میں ۱۸۶۰ء میں میر رجب علی اور اقبال سنگھ میں مقدمہ بازی ہوئی تھی، اس مقدمہ میں بھی بابری مسجد کو مسجد تسلیم کرتے ہوئے اس کے قریب کٹیا بنانے اور اس پر جھنڈا لہرانے کو خلاف مصلحت قرار دیا گیا تھا، بہرحال ۱۸۵۸ء کے مقدمہ کے بعد ۱۸۷۰ء میں فریقین کے درمیان احاطہ مسجد کی دیوار اور پھاٹک کے سلسلے میں تنازعہ ہوا، اور حسب ذیل درخواست خطیب مسجد کی جانب سے کورٹ میں دی گئی۔

نقل درخواست محمد اصغر خطیب و موذن بابری مسجد واقع جنم استھان اودھ

عادل زماں باغریب پرور، سلامت! بابری مسجد واقع جنم استھان اودھ میں .... دروازہ جدید جانب اتر ...... تیار ہو رہا ہے .... دیوار اس کی شکست کروا دی گئی ہے، اب بہ نظر بجا لاکی کے .... دکھن منھ چبوترہ واسطے قائم کرنے ملکیت اسی دیوار مسجد کی طرح .... خلاف عمل درآمد قائم ہوئی ہے کیونکہ لکھیم داس مہنت و دیگر مہنتان ما سبق کو سوائے چبوترہ کے دوسرے میں مداخلت نہیں ہے، دیوار احاطہ مسجد کی ہے کچھ چبوترہ کی نہیں ہے اس میں اکثر احکام عدالت ہیں کہ کوئی امر جدید نہ ہونے پائے اس صورت میں مدعا علیہ کو حکم ہووے کہ وہ کنارہ کش دروازہ کے ہوویں وسائل کو اجازت موجود ہوے کہ دروازہ و کنجی دروازہ پاس سائل کے رہے کہ وقت کثرت میلہ آمد و رفت دروازہ کھول دیا کریں و اگر ضرورت سمجھیں تو سائل سے دلوایا جائے ورنہ .... تاکہ باعث رفع تکرار ہو جائے لیکن کنجی متعلق سائل سے رہے مہنت سے نہ رہے

واجب جان کر عرض کیا۔

فدوی سید محمد اصغر خطیب و متولی مسجد بابری واقع اودھ۔[1]

اس مقدمہ کا بھی مسجد سے کوئی تعلق نہیں ہے، مسجد دونوں فریقوں کے نزدیک مسجد ہی ہے، اس مقدمہ کا فیصلہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسجد اور جنم استھان کا یہ جھگڑا خالص انگریزوں کی پیداوار ہے، اس مدت میں انگریز اور ہندو جنم استھان مسمار کرنے اور اس کی جگہ بابری مسجد بنانے کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں کر سکے تھے جب کہ اس نزاع کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کی پشت پر تاریخی نہ سہی تو کم از کم تاریخ نما ہی سہی کچھ دلائل ہوں، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی کہ ۱۸۷۰ء میں جب فیض آباد تحصیل کا بندوبست ہونے لگا تو اسکے سٹلمنٹ افسر اور قائم مقام ڈپٹی کمشنر پی۔ کارنیگی نے ایک رپورٹ پبلش کی، جس کے کچھ مندرجات یہ ہیں۔

"مقامی طور سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے، جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اجودھیا اسوقت ویران ہو چکا تھا، تین مندر یہ تھے، جنم استھان، سورگ دوار مندر (جو رام دربار بھی کہلاتا تھا) اور ترتیا کا ٹھاکر۔ جنم استھان وہ جگہ ہے جہاں رام چندر پیدا ہوئے، سورگ دوار وہ پھاٹک ہے جس سے وہ بیکنٹھ میں گئے، ممکن ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جہاں وہ جلائے گئے۔ ترتیا کا ٹھاکر وہ مقام ہے جہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی، اس کی یاد میں یہاں اپنی تین مورتیاں اور سیتا کی ایک مورتی رکھوائی، بابر کی تزک کے لیڈن کے نسخہ کے مطابق یہ شہنشاہ سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر جو اجودھیا سے دو تین کوس پر ہے ۲۸ مارچ ۱۵۲۸ء میں قیام پذیر ہوا وہ یہاں ایک شکار گاہ کا ذکر

[1] بابری مسجد پس منظر ص ۳۴ ۳۵

کرتا ہے جو اودھ سے سات آٹھ کوس پر سرجو کے ساحل پر تھی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ بابر کی تزک کے جتنے نسخے ہیں ان میں اجودھیا میں بابر کے آنے کا ذکر نہیں اس کے وہ اوراق مفقود ہیں، بابری مسجد میں دو جگہوں پر تاریخ لکھی ہے جب یہ بنائی گئی، یہ ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء ہے، یہ پتھر پر کھدی ہوئی ہے اس کے کتبے میں بابر کی شان و شوکت کا ذکر ہے جنم استھان ہنومان گڑھی سے چند میل فاصلہ پر ہے .... یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد میں عبادت اور پوجا کرتے رہتے تھے الخ[1]

اس رپورٹ میں اگرچہ کھل کر یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ "بابر" نے جنم استھان مندر مسمار کر کے اس کی جگہ بابری مسجد بنائی لیکن رپورٹ کے مندرجات اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ان کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

"نیگی" کی اس بے بنیاد رپورٹ کے ایک سال بعد ۱۸۷۱ء میں الگزنڈر کیننگھم نے اپنی رپورٹ مرتب کی کیننگم ہندوستان کے آثار قدیمہ کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، "سید صباح الدین عبدالرحمٰن" مرحوم کی رائے میں کیننگھم نے اپنی رپورٹ کی جلد اول میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے اس سے بہتر آج تک اس شہر پر کوئی اور مورخ و محقق نہیں لکھ سکا۔[2] اپنی اس رپورٹ میں اس نے وہ بات برملا کہہ دی ہے جسے "نیگی" نے اشارے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا تھا رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے

[1] بحوالہ بابری مسجد تاریخی پس منظر از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۶۔ [2] بابری مسجد۔ ص ۳۹۔

یہ چھوٹا سا قلعہ ہے جو دیواروں سے گھرا ہے، یہ ایک جدید مندر کو گھیرے میں
لئے ہوئے ہے جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً بہت پرانا ہے اس
کا تعلق "منی پربت" سے ہے۔ ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے "
اورنگ زیب" کے عہد سے پہلے کا نہیں ہے۔ شہر کے پوربی کونے میں
"رام کوٹ" ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں "رام چندر"
نے اشنان کیا، سورگ دوار یا سرگ دواری سورگ کا پھاٹک ہے
اتر پورب میں اس جگہ کا تعین کیا جاتا ہے، جہاں رام چندر جلائے گئے
کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا جو اشوک بٹ کہلاتا تھا یعنی یہ
وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا، شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق
سے رکھا گیا ہو۔ جس کے بارے میں لوگوں کو یقین ہے کہ جو لوگ یہاں
آکر مر جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے
ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے جہاں رام چندر کے بھائی
لکشمن نے اشنان کیا تھا اور یہاں سے ۱/۴ میل کے فاصلہ پر شہر
کے قلب میں "جنم استھان کا مندر" کھڑا ہے، یہاں رام چندر پیدا ہوئے
پھر پچھم کی طرف پانچ میل کی دوری پر "گپتار گھاٹ" ہے یہاں کئی
سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہیں سے لکشمن غائب ہو گئے تھے،
اس لئے اس کا نام گپتار ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے بعض
لوگ کہتے ہیں کہ یہاں لکشمن نہیں بلکہ "رام" غائب ہوئے، لیکن
سورگ دوارے میں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق
نہیں ہوتی"۔

کینگھم آگے چل کر یہ بھی لکھتا ہے۔

"پرانے شہر میں بودھ مت کے بیس مندر تھے، وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے اور برہمنوں کی آبادی بھی بہت تھی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں" ذکر بادتیا" کے بنائے ہوئے تین سو مندر ختم ہو چکے تھے اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا۔"[1]

کننگھم صاف طور پر لکھتا ہے کہ اجودھیا میں جو جدید مندر تعمیر کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر ان قدیم مندروں کی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جو مسلمانوں نے مسمار کر دئے تھے لیکن تاریخی طور پر اس دعویٰ کا کوئی ثبوت نہیں دیتا، یہ خود ساختہ کہانی وہ اسلئے سنا رہا ہے تاکہ ہندؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا کئے جائیں، اس سب کے باوجود وہ اس کا ذکر بالکل نہیں کرتا کہ رام جنم استھان مندر کو توڑ کر بابر نے مسجد بنوائی جو بابری مسجد کے نام سے مشہور ہوئی بلکہ اس کے برعکس وہ لکھتا ہے کہ "لکشمن گھاٹ سے ۱/۴ میل کے فاصلہ پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے" اگر کننگھم کے زمانہ میں یہ مندر موجود تھا تو پھر یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ بابری مسجد اسی کو توڑ کر بنائی گئی، یہ مندر اسی نام سے آج بھی اجودھیا میں موجود ہے۔

کننگھم کی پیش کردہ تحقیقات سے انگریز سامراج کے منصوبے خاطر خواہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو ۱۸۷۷ء میں جب حکومت کی نگرانی میں فیض آباد کا گزیٹیر مرتب ہوا تو اس میں تاریخی حقائق کو پس پشت ڈال کر ایسے مواد جمع کر دئیے گئے جن سے دونوں فرقوں کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکانے میں اچھی طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ گزیٹیر فیض آباد کا حسب ذیل پیراگراف ملاحظہ ہو۔

---

[1] بابری مسجد۔ ص ۴۴۔

• زبانی طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے حملہ کے وقت تین اہم مندر تھے جن میں کچھ پجاری بھی تھے، لیکن اجودھیا اس وقت ویران تھا، وہ تین مندر یہ تھے، (۱) رام جنم استھان. (۲) سورگ دوار، جو رام دربار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے (۳) ترتیا کا ٹھاکر، پہلے مندر پہ بابر نے مسجد بنائی اس میں تاریخ ۱۵۲۸ء لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیش رو نے ایک مسجد بنائی، مسلمانوں کا یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کرتے ہیں۔ جنم استھان وہ جگہ ہے جہاں رامچندر پیدا ہوئے اور سورگ دوار وہ جگہ ہے جہاں سے رام چندر بیکنٹھ گئے .... ترتیا کا ٹھاکر وہ جگہ ہے جہاں رام چندر نے بڑی بھینٹ چڑھائی، اپنی اور سیتا کی مورتیاں بھی بٹھائیں، لیڈن کی تزک بابری کے مطابق بابر نے ۲۸ر مارچ ۱۵۲۸ء کو سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر اپنے لشکر کا پڑاو ڈالا جو اجودھیا سے تین چار کوس کے فاصلہ پر تھا، یہاں وہ سات آٹھ دن ٹھہرا آس پاس کے علاقہ کو قابو میں کرتا رہا، سرجو کے ساحل پر ایک شکارگاہ تھی جو اودھ سے سات آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھی، یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ بابر کی تزک کے تمام نسخوں کے وہ صفحے نہیں ہیں جن میں اجودھیا میں رہ کر اس نے جو کچھ کیا اس کا ذکر ہے بابر کی مسجد ۹۳۵ھ ۱۵۲۸ء میں بنی اس میں ایک منقش پتھر ہے جس پر ایک کتبہ ہے۔ اس میں بابر کی شان و شوکت کا اظہار کیا گیا ہے، اگرچہ اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا مگر وہاں کم از کم جنم

استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا، کیونکہ وہاں اب بھی کچھ ستون ہیں اور اچھی حالت میں ہیں، ان کو مسلمانوں نے بابری مسجد کی تعمیر میں ضرور استعمال کیا، وہاں گہرے رنگ کے کالے پتھر ہیں جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں ان پر طرح طرح کے نقش بنے ہوئے ہیں، لیکن میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور ان سے مختلف ہیں جن کو میں نے بنارس یا دوسری جگہوں میں دیکھا ہے وہ سات یا آٹھ فٹ لمبا ہے نیچے چوکور ہے بیچ اور کیپٹل میں یا تو گول یا ہشت پہل بنا ہوا ہے۔ .... یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت (یعنی ۱۸۵۵ء) تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد و مندر میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں تاکہ حد بندی کرکے جھگڑا روک دیا جائے۔ مسجد میں مسلمان نمازیں پڑھیں اور سلاخوں کے باہر ہندوؤں نے جو چبوترہ بنالیا ہے اس پر پوجا کیا کریں الخ۔

"نیگی" نے ۱۸۷۰ء میں جو باتیں اشارے میں کہی تھیں، انھیں ۱۸۷۱ء میں کننگھم نے کسی حد تک عمومی انداز سے کھولنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے چھ سال بعد گزیٹیر کے مرتب نے پورے وثوق کے ساتھ متعین طور پر لکھدیا کہ "پہلے مندر (یعنی رام جنم استھان) پر بابر نے مسجد بنائی، دوسرے مندر (یعنی سورگ دوار) پر اورنگزیب نے ایک مسجد اور تیسرے (یعنی ترتیا کا ٹھاکر) پر اس سے پہلے کسی حکمراں نے ایک مسجد بنائی" یہ ہے انگریزوں کا انداز تحقیق کہ "ہر کہ آمد عمارت نو ساخت"۔

سوال یہ ہے کہ گزیٹر کے مرتب کے پاس وہ کون سے تاریخی ثبوت ہیں جن کی بنا پر یہ اہم بیان دے رہا ہے، بابر کے اجودھیا آنے کے بارے میں کیا تاریخی شواہد

ہیں جن کے پیش نظر یہ مفروضہ وضع کر لیا گیا کہ بابر اجودھیا آیا تھا مگر تزک کے وہ اوراق جن میں اس کے یہاں آنے کا ذکر تھا گم ہو گئے ہیں۔

پھر بابر کے عہد میں مؤلف گزیٹر کی یقینی اطلاع کے مطابق اجودھیا ویران ہو چکا تھا، تو پھر وہ کس طرح قیاس آرائی کر رہے ہیں کہ (اس ویرانی کے باوجود) "رام جنم استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا۔ اس غیر یقینی اور مشکوک بات کے لکھنے کی غرض شرانگیزی کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ رام جنم استھان کے کچھ ستون بابری مسجد میں میں ضرور لگائے گئے"، لیکن اپنے اس یقین کو یہ لکھ کر خود ہی مشکوک بنا دیتا ہے کہ میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے زیادہ ملتے جلتے ہیں، یعنی یہ رام جنم استھان کے نہیں بلکہ بودھ مت کے کسی مندر کے ہیں اور ایسا ہونا ممکن بھی ہے کیونکہ بودھوں کے اجودھیا میں بہت سے مندر تھے خانقاہیں تھیں جن کو برہمنوں نے ختم کیا وہاں ان ٹوٹے ہوئے مندروں کے کچھ ستون پڑے ہوں جن کو بابری مسجد میں لگا دیا گیا ہو،

انگریزوں کے برخلاف ہندو مؤرخین کی تحقیق :۔

(۱) ڈاکٹر آر، ایل، شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی دہلی اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"بعض مؤرخین " مہابھارت " میں بیان کئے گئے " رام " کو حقیقی کردار مانتے ہیں، یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں، اور مہابھارت کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے ایک ہزار سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، اگر ہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو ما، راماین میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی وجود کے آثار ملنے

چاہیئے۔ اسی مقصد کے تحت تین مقامات کی کھدائی ہوئی (۱) فیض آباد ضلع میں اجودھیا کی، (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال کی سمت واقع موضع شرنگ ویر پور کی (۳) الہ آباد میں واقع بھاردواج آشرم کی۔ اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے ہوئی تھی، اس وقت بھی وہاں آبادی کے نشان عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ سو سال پہلے کے نہیں ملے تھے، اور اب تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانہ پر وہاں (اجودھیا) کی کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے (زیادہ سے زیادہ) سات سو سال قبل تک کے آبادی کے نشان پائے گئے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام جی کی نگری تھی جو ان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے کہ) رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانے کا تعلق اور جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا، اجودھیا کی آبادی عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے چھ یا سات سو سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰؑ سے پچیس سو سال قبل یا بعض مورخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی بھومی کیسے ہو سکتا ہے اور اس کا ثبوت کیا ہے؟

(۲) سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے، ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۶۰ انچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بنا پر میدانوں میں جنگل کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا، جنگلوں کی صفائی کا کام انھیں جلا کر یا لوہے کی کلہاڑیوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات کی رو سے یہ طے ہو چکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں سات سو سال قبل از مسیح نہیں تھا۔

(۳) قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنھیں "مہاجن پد" کہا جاتا تھا

نیز پالی ادب میں بھی اجودھیا کا ذکر ہے، اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "بدھ" کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہو گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۴)۔ بالمیکی رامائن کے مطابق کوشل کا پایۂ تخت اجودھیا سرجو ندی کے داہنی سمت سرجو سے ڈیڑھ یوجن ۱۲ ۱/۲ میل کے فاصلے پر تھا اور سرجو اس سے پچھم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پر ہے، پھر آج سرجو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہو سکتا ہے۔ [۱]

(۲) پنڈت واجپئی لکھتے ہیں۔

: زمانے کے تعین یا اس کی گنتی کا جو ہندوستانی طریقہ ہے، اس کے مطابق کرۂ ارض کو وجود میں آئے چھ "منونتر" بیت چکے ہیں، اور اس وقت دنیا ساتویں "منونتر" کے درمیانی حصے میں جی رہی ہے، جس کا نام "دیواسوت" ہے ہر منونتر کے آخر میں ایسا سیلاب آتا ہے جو ساری روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے کر زندگی کے آثار ختم کر دیتا ہے "منونتر" اصل میں ایک پورے زمانے پر محیط ہے .... ہر منونتر کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر حصے کو "یگ" کہتے ہیں۔

شری رام چندر جی "تریتا یگ" میں پیدا ہوئے اور شری کرشن جی "دواپر یگ" میں، فی زمانہ ہم "کل یگ" میں ہیں، کل یگ کے آخر میں بھی ایک طوفان تباہ خیز سیلاب آئے گا، اس کے بعد نئے سرے سے زندگی کا آغاز ہو گا، جن کو نیا منونتر کہا

---

[۱] اٹیک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص ۱۲، ۱۳

جائے گا" وشیوت منونتر" میں بھی اس تریتایگ کا آغاز ۲۱ لاکھ برس قبل ہوا تھا، جو ۱۲ لاکھ برس تک چلتا رہا۔

" والمیکی" اور " تلسی داس " کے مطابق جس وقت رام جی کی پیدائش ہوئی اس وقت " ابھیجیت نکچھتر" تھا اور چاند کرک راشی میں تھا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ علم نجوم کے اعتبار سے ابھیجیت نکچھتر ہمیشہ ہی مکر یا کمبھ راشی میں ہی ہوگا، اس لئے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رام جی کا جنم کسی اور دور یا زمانے میں ہوا ہوگا جب علم نجوم کے مطابق حساب کرنے کے طریقے میں کچھ اور ہی طریقے ہوں گے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ رام جی کی پیدائش موجودہ اجودھیا میں ہوئی تھی اور ان کی پرستش اسی مندر میں ہوسکتی ہے جس کی تعمیر دو ہزار برس پہلے راجہ بکرماجیت نے کرائی تھی جس کو بعد میں شہنشاہ "بابر" نے مسجد میں تبدیل کر دیا تھا، بھگوان کے اوتار کہنے کے مقدس نظریے کے خلاف ہے۔ یہی نہیں یہ ہندو مذہب کے بنیادی اصول ومعتقدات کے بھی خلاف بھی ہے [1]

(۳) ڈاکٹر رمیش پرشاد گرگ اپنی تحقیق یوں بیان کرتے ہیں۔

" رام جنم بھومی مندر توڑ کر بابری مسجد بنانے، کاشی وشوناتھ مندر توڑ کر گیان باپی مسجد بنانے، متھرا کے کرشن جنم بھومی مندر توڑ کر عیدگاہ بنانے، جونپور کی اٹالہ دیوی مندر توڑ کر اٹالہ مسجد بنانے، بندو مادھو مندر کو توڑ کر دھرہرہ کی مسجد تعمیر کرانے کی بات محض من گھڑت کہانی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اس کا مقصد ملک کے امن وامان کو خطرہ میں ڈالنا اور ہندو مسلم فساد کرا کے قومی اتحاد کا شیرازہ بکھیرنا ہے، کوئی تعجب نہیں کہ ان فرقہ پرست تنظیموں کو بیرونی ملکوں سے امداد بھی مل رہی ہو جو مسجدوں کو مندر ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

---

[1] بابری مسجد غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں۔ مرتبہ محمد عبدالسمیع ندوی، ص ۵ تا ۱۰۔

جہاں تک مسلم حکمرانوں کا سوال ہے ان کی رواداری اور ہندو دوستی کا اعتراف سبھی انصاف پسند مؤرخوں نے کیا ہے، بابر، ہمایوں، شیر شاہ سوری، اور اکبر اور جہانگیر کی رواداری، انصاف، رعایا پروری کی تعریف سبھی نے کی ہے، سر جوناتھ سرکار ڈاکٹر تاراچند اور ایشوری پرشاد کی تاریخی کتابیں اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ ان بادشاہوں نے ہندوستان میں کسی مندر کو نہیں توڑوایا اور نہ ہی مذہبی تعصب سے کام لیا، ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی تصنیف " انڈیا ڈیوائیڈڈ" میں لکھا ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے نصیرالدین محمد ہمایوں کو حکومت کے معاملے میں تعصب سے کام نہ لینے کی ہدایت کی تھی، اور ہندو رعایا کی دلجوئی کے لئے گئوکشی پر پابندی لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ وصیت نامہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو رعایا حکومت کی مطیع و فرماں بردار ہوتی ہے اس کے عبادت خانوں کو نقصان نہیں پہونچانا چاہیئے۔ اور اسکی حفاظت کی جانی چاہیئے۔

اس واضح ثبوت کے باوجود یہ مان لینا کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اس پر "بابری مسجد" تعمیر کروائی صریح جھوٹ ہے اور سچائی کو جھٹلانا ہے۔ ...

. . . . جہاں تک تاریخی اور دستاویزی ثبوت کا سوال ہے۔ " بھگوان شری رام " بھگوان شری کرشن" اور " بھگوان شنکر" کسی کا سال پیدائش تاریخی کتابوں سے ثابت نہیں ہوتا، یہ سبھی مہاپرش پوراننک ہیں اور بکرمی سمیت سے سیکڑوں سال قبل پیدا ہوئے " بالمیکی رامائن"، " مہابھارت" " وشنو پران" " شریمد بھگوت گیتا" ہنومان چالیسا، گوسوامی تلسی داس کی رام چرت مانس جیسی مقدس کتابیں بھی ان مذہبی رہنماؤں کا سال پیدائش بتانے سے قاصر ہیں "تلسی داس جی" رام چندر جی کے بہت بڑے بھگت تھے، انھوں نے شری رام کی مدح سرائی میں سینکڑوں

اشعار لکھے، لیکن انھوں نے رام جنم بھومی توڑے جانے کا کوئی ذکر اپنی کسی کتاب میں نہیں کیا، جب کہ بابر کا انتقال ۱۵۳۰ء میں ہوا تھا اور اکبر ۱۵۵۶ء میں بادشاہ ہوا تھا، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "گوسوامی تلسی داس جی" نے اکبر کے خوف کی وجہ سے اس کے دادا "بابر" کے ظلم کے خلاف زبان نہ کھولی، اور کوئی بھی ہندو مصنف "بابر" کے ظلم کے خلاف "بہادر شاہ" کے عہد حکومت تک مغلوں کے خوف کی وجہ سے نہ بولا تو انگریزوں کے دور حکومت میں تو اس کا تصفیہ کروایا ہی جاسکتا تھا، کہ انگریز خود ہی مسلمانوں کے خلاف تھے انھیں تو اس کے ذریعہ ہندوستان کے اکثریتی فرقہ کو اپنا ہم نوا بنانے اور مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کا ایک اور موقع ہاتھ آجاتا، کیونکہ ان کا مقصد تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنا تھا، اگر ان کے سامنے "رام جنم بھومی مندر" کا ثبوت پیش کیا جاتا تو وہ ہندوؤں کو واپس دینے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں ہندو قوم میں بہت سے دانشور، مفکر، مورخ سیاسی اور مذہبی رہنما ہوئے، مثلاً دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، سوامی رام کرشن پرم ہنس۔ راجہ رام موہن رائے لوک مانیہ۔ ملک لالہ لاجپت رائے، دین چند پال دیس بندھو چترنجن داس۔ پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، شیو پرشاد گپتا راجہ جی۔ سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، منشی پریم چند ڈاکٹر سمپورنانند، سردار پٹیل، ڈاکٹر منوہر لوہیا، مرارجی ڈیسائی، چودھری چرن سنگھ وغیرہ، لیکن کسی نے بھی اپنی تحریر اور تقریر سے "بابری مسجد" کے رام جنم بھومی مندر ہونے کی شہادت نہیں دی، جب کہ بابری مسجد کا وجود تاریخ سے ثابت ہے [۱]

(۴) پٹنہ پرگتی شیل لیکھک سنگھ کے زیر اہتمام دوسری ٹاؤن کانفرنس

---

[۱] بابری مسجد غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں۔ ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ ۔

سے خطاب کرتے ہوئے مشہور تاریخ داں پروفیسر شرما نے کہا۔

"کوئی بھی تاریخ داں اس بات کو ثابت نہیں کرسکتا کہ" اجودھیا "بھگوان رام کا پیدائشی مقام ہے کیونکہ یہ واقعہ چار ہزار سال قبل کا ہے، اور کوئی بھی حتمی ثبوت اس سلسلے میں دستیاب نہیں ہے، پروفیسر شرما نے یہ بھی کہا کہ متھرا کو" کرشن بھگوان" کا پیدائشی مقام کہا جاتا ہے، لیکن وہاں بھگوان کرشن کی کوئی بھی پرانی مورتی کھدائی میں دستیاب نہیں ہوسکی ہے، عیسیٰ مسیحؑ سے قبل کی چیزیں وہاں کھدائی میں ملی ہیں لیکن کسی بھی چیز سے بھگوان کرشن کا ثبوت نہیں ملتا" ۔ لہ

(۵) "ہندوستان کا شاندار ماضی" کا مصنف، اے، ایل باشم لکھتا ہے۔

" یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ "رام" کوشل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے "رامائن" کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانہ کیلئے ایک اہم حکومت تھی"۔ ٹہ

(٦) سروپلی گوپال، رومیلا تھاپر، بپن چندر، ایس بھٹاچاریہ، سودیراجیسوال ہربنس مکھیا، کے این پنیکر، آر چمپک لکشمی، ستیش سبروال، بی ڈی چٹوپادھیائے آر این ورما، کے میناکشی، دلباغ سنگھ، مردولا مکرجی، مادھون پلات، آدتیہ مکرجی ایس ایف رتناگر، نیلادری، بھٹاچاریہ، کے کے تریویدی، یوگیش شرما، کنال چکرورتی، بھگوان سنگھ جوش، راجن گرو کل، ہیمانشورے کی مشترکہ تحقیق کے مطابق بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ کا تعلق درحقیقت تاریخ سے نہیں بلکہ عقیدہ موجودہ سیاست، حکومت اور اقتدار کی رسہ کشی سے ہے، یہ تمام غیر مسلم دانشور متفقہ طور پر لکھتے ہیں

لہ روزنامہ مشرقی آواز دہلی، ۲۷/اپریل ۱۹۸۷ء ص ۲۔

ٹہ ہندوستان کا شاندار ماضی ص، ۶۷، ۶۸۔ طابع وناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۷ء

کیا اجودھیا میں رام پیدا ہوئے تھے؟ اس سوال سے جڑا ہوا ایک دوسرا سوال ہے کہ کیا آج کا اجودھیا وہی ہے جس کا ذکر رامائن میں ہوا ہے؟

رام کہانی کے واقعات کو بالمیکی نے اپنی رامائن میں ایک طویل نظم کی شکل میں درج کیا ہے، یہ واقعات گمشدہ "رام کتھا" سے لئے گیے ہیں، چونکہ یہ نظم ہے اور اس کے واقعات، کردار، اشخاص اور جگہوں کی تفصیل میں شاعر کے تخیل کا بھی کافی دخل ہے اور اسی لئے جب تک ان کے ساتھ دوسرے معتبر ثبوت نہ ہوں انھیں تاریخی نہیں کہا جا سکتا، اکثر تاریخی ثبوت عام عقیدوں اور روایتوں کے قطعی خلاف ہوتا ہے۔

بالمیکی رامائن کے مطابق اجودھیا کے راجہ رام کلیگ شروع ہونے سے ہزاروں سال پہلے ترتیا یگ میں پیدا ہوئے، کلیگ ۳۱۰۲ قم میں شروع ہوتا ہے، اس زمانے میں آثار قدیمہ کی رو سے اجودھیا آباد ہی نہیں تھا، یہاں سب سے پرانی ممکن بستی آٹھویں صدی قبل مسیح میں تھی، اس زمانے میں بالمیکی رامائن میں بیان کئے گئے طرز زندگی کے برخلاف رہن سہن خاصا معمولی اور سادہ تھا بالمیکی رامائن میں اعلیٰ شہری زندگی، شاہی محلات اور عمارتوں کا ذکر ہے جن کے لئے آٹھویں صدی قم کے آثار قدیمہ سے کسی طرح کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔

اجودھیا کس جگہ تھا اس کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے بدھ متی کی پرانی تحریروں کوشل کے اہم شہروں میں سراوستی اور ساکیت کا ذکر ملتا ہے اجودھیا کا نہیں، جینی تحریریں بھی ساکیت کو کوشل کی راجدھانی بتاتی ہیں، کچھ حوالے اجودھیا نام کے ایک شہر کے بھی ملتے ہیں جو سرجو کے بجائے گنگا کے کنارے آباد تھا، پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سکند گپت نے جس نے اپنے سونے کے سکوں پر وکرمادتیہ کا لقب اختیار کیا تھا، ساکیت کو اپنی راجدھانی بنائی اور اس کا

نام اجودھیا رکھا۔ اس طرح رامائن کا اجودھیا جو شاید خیالی تھا اس کی شناخت بہت بعد میں ساکیت سے ہوئی۔ اس سے بہر حال یہ لازم نہیں ہوتا کہ یہ گپت حکمراں رام کا بھگت تھا۔ ساکیت کو اجودھیا کا نام دے کر سکند گپت نے سوریہ ونشی حکمرانوں کا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، راجہ رام کے بارے میں روایت ہے کہ وہ سوریہ ونشی تھے۔

ساتویں صدی عیسوی سے اجودھیا کے بارے میں قطعی تحریریں ملتی ہیں پہلے ہزار سال عیسوی اور دوسرے ہزار سال کے ابتدائی زمانے کے پرانوں میں رامائن کے حوالے ملتے ہیں اور اجودھیا کو کوشل کی راجدھانی بتایا گیا ہے (وشنودھرموتر مہاپران ۔ج ۱ ص ۲۲۴۰) ایک حد تک اجودھیا کے بارے میں مقامی روایت میں بھی اجودھیا کی ابتدا کی گول مول اور گنجلک تاریخ کا اعتراف ملتا ہے۔ اس روایت کے مطابق ترتیایگ کے بعد اجودھیا گم ہو گیا تھا جس کو وکرمادتیہ نے پھر سے دریافت کیا۔ اجودھیا کی تلاش کے دوران وکرمادتیہ کی ملاقات تیرتھوں کے حکمراں پریاگ سے ہوئی جسے یہ معلوم تھا کہ ایودھیا کہاں ہے اور جس نے وکرمادتیہ کی رہنمائی کی، لیکن پریاگ سے اس جگہ کے بارے میں سمجھ لینے کے باوجود وکرمادتیہ اجودھیا نہیں پا سکا، چنانچہ بعد میں ایک یوگی نے بتایا کہ وہ ایک گائے اور ایک بچھڑی کو آزاد چھوڑے، جہاں بچھڑی کے تھن سے دودھ ٹپکنے لگے وہی اجودھیا ہوگا اس طرح یوگی کی ہدایت کے مطابق قدیم اجودھیا دریافت ہوا۔ اجودھیا کے دوبارہ پانے کا قصہ اور اس کے پرانے پن کا دعویٰ اس شہر سے ایک مخصوص طرح کے مذہبی تقدس جوڑنے کی کوشش تھی، جس کا تعلق تاریخی طور پر اس شہر سے نہ تھا، لیکن ان کہانیوں میں بھی اجودھیا کی شناخت کا عمل غیر یقینی اور من مانا تھا۔ اگر آج کا اجودھیا پانچویں صدی عیسوی سے پہلے ساکیت کے نام سے جانا جاتا تھا تو بالمیکی رامائن کا

اجودھیا خیالی تھا اور اس صورت میں اجودھیا میں رام جنم بھومی کا ہونا تاریخی ثبوت کا نہیں بلکہ محض عقیدہ کا معاملہ ہو کر رہ جاتا ہے، رام جنم بھومی کی تاریخ میں شبہ کے برخلاف گوتم بدھ کی جنم بھومی کے بارے میں تاریخی طور پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہے، گوتم بدھ کے مرنے کے دو سو سال بعد مہاراجہ اشوک موریہ نے ان کی پیدائش کی جگہ لمبنی گاؤں میں نشانی کے طور پر ایک کتبہ لگایا تھا، یہ غور طلب ہے کہ اس کتبہ میں صرف گاؤں کا حوالہ ہے، پیدائش کی مخصوص جگہ کی کوئی نشاندہی نہیں ہے اس دعویٰ کے لئے کہ بابری مسجد ایک مندر توڑ کر بنائی گئی، ابھی تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے، اس بات کا ثبوت بھی کہ یہ مسجد بابر کی طرف سے بنائی گئی مسجد کے دروازے کے دونوں طرف کے کتبوں پر درج اشعار سے ہی ملتا ہے بابرنامہ کی مترجم مسز بیوریج نے اپنے ترجمہ کے ایک ضمیمہ میں ان اشعار کا متن اور انگریزی ترجمہ درج کیا ہے، اس ترجمہ کی اصل عبارت کچھ اس طرح سے ہے۔

"بابر بادشاہ کے فرمان کے مطابق کہ جس کے انصاف کی عمارت کی بلندی آسمان تک پہنچتی ہے اس کے ایک امیر سعادت نشان میر باقی نے اس مہبط قدسی کو بنایا، بود خیر باقی (یہ کار خیر سدا قائم رہے)

بابرنامہ مترجم مسز بیوریج مطبوعہ ۱۹۲۲ء ص ۱۱×۷×۱۔

ان کتبوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے یہ مسجد بنوائی، ان میں کہیں بھی مسجد کی جگہ پہلے سے کسی مندر کے ہونے کا ذکر نہیں ہے، نہ ہی بابر کی تزک میں اجودھیا میں کسی مندر کے ڈھانے کا حوالہ ملتا ہے، آئین اکبری میں اکبر کے زمانے کے تاریخ نویس ابوالفضل نے اجودھیا کو رام چندر کا وطن بتایا ہے، ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ رام چندر تریتا یگ میں تھے اور یہ کہ ان کی ذات میں روحانی عظمت اور شاہی مرتبت دونوں خوبیاں جمع تھیں، آئین اکبری میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ہے

کہ اجودھیا کی یہ مسجد بابر کے زمانے میں کسی مندر کی جگہ بنائی گئی تھی.

یہ بات غور طلب ہے کہ اودھ کے باشندے تلسی داس جو اکبر کے زمانے میں تھے اور رام کے بڑے بھگت تھے ملیچھوں کے عروج پر فکر مند ہیں لیکن رام کی جنم بھومی پر واقع کسی مندر کے توڑنے کا کہیں ذکر نہیں کرتے، یہ داستان انیسویں صدی میں رواج پاتی ہے اور سرکاری کاغذات میں اسے جگہ ملنی شروع ہوتی ہے جو بعد میں اس مسئلہ کے لئے تاریخی سچائی کی طرح تحقیق کئے بغیر دہرایا جانے لگا (دیکھئے پی. کارنیگی ہسٹاریکل اسکیچ آف فیض آباد تحصیل ضلع فیض آباد. لکھنو مطبوعہ ۱۸۷۰ء ایچ آر نیول فیض آباد ڈسٹرکٹ گزیٹر الٰہ آباد مطبوعہ ۱۹۰۵ء)۔

مندرجہ بالا اقتباس کے حاشیہ میں مسز بیوریج نے کسی تاریخی ثبوت کے بغیر موجودہ صدی کے شروع میں اس قصہ کی تصدیق کر دی، مسز بیوریج کی رائے میں بابر اجودھیا کے تقدس اور وقار سے متاثر ہوا اور چونکہ وہ مسلمان ہونے اور اپنے پیغمبر محمدؐ کے سچا تابع ہونے کی حیثیت سے دوسرے مذہب کو برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لئے اس نے اپنا یہ مذہبی فریضہ سمجھا کہ مندر کے کم از کم ایک حصہ کو توڑ کر مسجد تعمیر کروائے، کسی ایک مخصوص مذہب کے ماننے والے کے لازمی کردار اور رویہ کے بارے میں مسز بیوریج کی منطق اور مفروضہ ظاہر ہے انتہائی قابل اعتراض ہے، وہ اس دعویٰ کیلئے کہ یہاں پہلے سے کوئی مندر تھا اور مندر کی جگہ مسجد بنوائی گئی، کوئی ثبوت نہیں دیتی، جب کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی طرف بابر کی پالیسی عام طور پر انصاف اور رواداری پر مبنی تھی۔

برطانوی افسروں کو ہندوستان بنیادی طور پر مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان جھگڑے اور تناؤ کا ملک نظر آتا تھا اور اس لئے ایسے قصوں کے جواز کی انھوں نے ضرورت نہیں سمجھی، لیکن تاریخ داں کے لئے کسی بھی تاریخی بیان

کے ماخذ اور سند کی جانچ بہر حال ضروری ہے، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جہاں یہ حقیقت ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر پہلے سے کسی مندر کی جگہ نہیں ہوئی وہیں یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں کے لئے کبھی اس مسجد کی کوئی غیر معمولی مذہبی یا تہذیبی اہمیت نہیں رہی ہے۔

یہ خیال کہ مسلمان حکمرانوں کا عام طور پر ہندوؤں کے مقدس مقامات کی طرف رویہ مخالفانہ تھا تاریخی طور پر بے بنیاد ہے، ہندوؤں کی ایک زیارت گاہ کی حیثیت سے اجودھیا کی شہرت اور توسیع میں اودھ کے مسلمان نوابوں کی سرپرستی کا بڑا رول رہا ہے، حالیہ تاریخی تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نوابی حکومت میں کالیستھ اور اودھ کی فوج میں شیو بھگت ناگا خاصے غالب رہے ہیں، ہندوؤں کے متبرک مقامات اور مندروں کی سرپرستی اور ان کیلئے وظائف نواب کے طریقہ حکومت کا ایک لازمی حصہ تھا، نواب صفدر جنگ کے دیوان نے اجودھیا میں کئی مندروں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اسی نواب نے ہنومان ٹیلہ کے مندر کی تعمیر کے لئے نروان اکھاڑہ کو زمین کا عطیہ دیا، اس ٹیلہ پر مندر کیلئے گڑھی بنانے میں نواب آصف الدولہ نے عطیہ دیا[1]۔

غیر مسلم دانشوروں کی ان شہادتوں سے واضح ہے کہ جنم استھان کا دعویٰ محض فرضی ہے جس کا ثبوت نہ تو تاریخ سے پیش کیا جا سکتا ہے نہ مذہبی نوشتوں سے اور نہ ہی جدید طریقۂ تحقیق سے۔

بابری مسجد کو غیر قانونی طور پر مندر بنانے کی ناروا کوشش:-

سنہ ۱۹۴۸/۴۹ء میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی، دہلی، میوات، ہریانہ، پنجاب وغیرہ صوبوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس نے ملک کے نظام کو کچھ دنوں کے لئے بالکل معطل بنا دیا۔ اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں

[1] قومی آواز۔ مورخہ ۲ نومبر ۱۹۹۰ء جلد ۵۵ شمارہ ۳۰۳

۲۲/۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں "ہنومان گڑھی" کے مہنت "ابھے رام داس" اپنے چیلوں کے ساتھ مسجد کی دیوار پھاند کر اس میں گھس گئے اور اس کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی، چنانچہ اس وقت وہاں ڈیوٹی پر متعین کانسٹبل "ماتو پرشاد" نے تھانہ میں حسب ذیل رپورٹ درج کرائی۔

"ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم آدمیوں نے مسجد کے اندر مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے، جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔"

اس رپورٹ کی بنیاد پر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور "پریہ دت رام" چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا لگا دیا، اور فریقین کے نام ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے بارے میں ثبوت پیش کریں۔

اس غیر قانونی و غیر مذہبی حرکت سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور فرقہ وارانہ کشیدگی بہت بڑھ گئی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی توجہ اس کی طرف دلائی جس پر پنڈت جی نے یوپی کے وزیر اعلیٰ گوند بلبھ پنت کو متوجہ کیا چنانچہ انھوں نے ضلع مجسٹریٹ کے کے نائر کو ضروری کارروائی کرنے کی ہدایت دی لیکن ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے اس نے اس معاملہ میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی جس کی بنا پر اس سے استعفاء لے لیا گیا لیکن مورتی اسی طرح مسجد میں رکھی رہی۔

اس مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی رکھنے کے تقریباً ۲۳/۲۴ دن بعد ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو "گوپال سنگھ" نے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسن عرف اچھن

محمد سمیع، ڈی، ایم، سٹی مجسٹریٹ، اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا کہ مسجد جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر مسلمان اور ضلع کے حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اس لئے اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کرنے کی باضابطہ اجازت دی جائے۔

جوابِ دعویٰ از ایس، پی فیض آباد

اس مقدمہ کے سلسلہ میں فیض آباد کے ایس پی کرپال سنگھ نے یکم جون ۱۹۵۰ء کو جواب دعویٰ داخل کیا جس میں لکھا۔

"یہ زمانہ قدیم سے "بابری مسجد" ہے اور اس میں مسلمان ہمیشہ سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔"

ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا بیان

یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے، ان، اڈگرا نے ایک تحریری حلف نامہ داخل کیا جس کے پیراگراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ میں یہ بیانات دئیے۔

پیرا ۱۴:- یہ جائداد نزاعی "بابری مسجد" کے نام سے مشہور ہے، اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمان استعمال کرتے ہیں، اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں کیا گیا۔

پیرا ۱۵ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا۔

پیرا ۱۶ اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی اور علاقہ میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا اس لئے حکام کو امن و امان کی خاطر مداخلت کرنی پڑی۔

پیرا ۱۷ ہندو مسلمان میں کشیدگی پیدا ہوئی، تو سٹی مجسٹریٹ کورودت سنگھ نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو سیکشن ۱۴۴ انافذ کر دیا۔

پیرا ۱۸ اسی تاریخ کو اڈیشنل مجسٹریٹ شری مارکھنڈے سنگھ نے فریقین کو طلب کر کے اپنا اپنا معاملہ پیش کرنے کو کہا۔

پیرا ۱۹ مجسٹریٹ مذکور نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر اراضی (بابری مسجد) کو قرق کر کے فیض آباد اور اجودھیا کے میونسپل بورڈ کے چیرمین کو رسیور مقرر کیا اور ان کو اختیار دیا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کریں اور اس کے نظم و نسق کے لئے اسکیم پیش کر کے منظوری لیں۔

ایس، پی اور ڈپٹی کمشنر دونوں کے تحریری بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے "بابری مسجد" مسجد ہی کی حیثیت سے معلوم و متعارف تھی اور مسجد ہی کے طور پر مسلمان اسے استعمال کرتے تھے۔

یوپی، سنّی سنٹرل وقف بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مقدمہ

گوپال سنگھ کے مذکورہ بالا مقدمہ کے علاوہ ۱۹۶۱ء میں دو اور مقدمے دائر کئے گئے ایک "پریم ہنس" رام چندر داس" اور ایک نرموہی اکھاڑے کی طرف سے ان کے جواب میں یو، پی سنّی سنٹرل وقف بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے مقدمہ دائر کیا گیا جس میں کہا گیا کہ یہ "بابری مسجد" مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے رہے ہیں، لہٰذا یہ مسجد انھیں واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

اب تک کی تمام مقدموں کی فائلیں الگ الگ تھیں، عدالت کی سہولت کے پیش نظر اسکے حکم سے انھیں یکجا کر دیا گیا اور سنّی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۱۲/۱۶

کو رہنما کیس قرار دیا گیا۔

مسجد میں غیر قانونی تبدیلی کی نالش

اسی دوران "پریہ دت" ریسور کا انتقال ہو گیا، اور ان کی جگہ "کے کے رام ورما" آنریری مجسٹریٹ کو ریسور مقرر کیا گیا، مگر ان کے ریسوری کے زمانہ میں ہندوؤں نے مسجد میں تبدیلی شروع کر دی، چنانچہ مسلمانوں کی شکایتی درخواست پر ان کو ریسوری سے ہٹا دینے کا حکم ہو گیا، ہندو اس فیصلہ کے خلاف لکھنؤ بنچ ہائی کورٹ سے اسٹے آرڈر لے آئے، اس سلسلے میں مقدمات کی جملہ فائلیں ہائی کورٹ میں طلب کر لی گئیں، جس کے بعد فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے، ہائی کورٹ میں بھی اس سلسلہ میں مقدمہ کی کوئی سماعت نہ ہو سکی۔

تبدیلیوں کی تفصیل

گذشتہ تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ "بابری مسجد" کے گرد چہار دیواری بنی ہوئی ہے اور صدر دروازہ اتر جانب ہے جس پر موٹے حرفوں میں "اللہ" کندہ تھا مگر ریسور اور پولس کی نگرانی کے باوجود اس کو کھرچ کر مٹا دیا گیا، اور دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ آویزاں کر دیا گیا، احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور مسجد کی درمیانی خالی جگہ پر سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنا لیا گیا، اور اس کا نام "پری کرما" (یعنی طواف کرنے کی جگہ) رکھا گیا، مسجد کے صحن میں اتر کی طرف ایک ہینڈ پائپ بھی لگا دیا گیا۔ اور مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر بنا لیا گیا اسی مندر کے پاس مہنتوں کے رہنے کی جگہ بھی بنا لی گئی۔ دکھن سمت نام نہاد جنم استھان کے چبوترہ پر ایک مندر تعمیر کر لیا گیا، اور اسی کے متصل دو اور مندر بھی بنا لئے گئے، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگا دیا گیا، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۶ء

کے درمیانی عرصہ میں کی گئیں اور ریسیور کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔

مسجد کو مندر بنانے کی آخری سازش

ہائی کورٹ بنچ لکھنؤ میں ریسیور ، درہا ، کے سلسلہ میں داخل رٹ زیر سماعت ہے اس لئے قانونی طور پر ابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی تھی اس کے باوجود ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو " رمیش پانڈے " نامی ایک غیر متعلق شخص نے جو اب تک کے کسی مقدمہ میں فریق نہیں تھا فیض آباد کے صدر منصف کے یہاں ایک درخواست دی کر۔

"جنم استھان میں پوجا پاٹ کی اجازت ہونی چاہیے اسلئے عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کر جنم بھومی یا بابری مسجد کا تالا کھولدے تاکہ میں اور دیگر ہندو بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا کر سکیں"

مگر منصف صدر نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی کہ "اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا" اس فیصلہ کے خلاف فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے ، ایم ، پانڈے کی عدالت میں ۳۰ جنوری ۱۹۸۶ء کو اپیل کی گئی اور انھوں نے یکم فروری ۱۹۸۶ء (سنیچر) کو پونے بارہ بجے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ضلع انتظامیہ اس جگہ کا تالا کھول دے اور رمیش پانڈے و دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی جائے ، اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے ، نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔

ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کے فیصلہ کا متن

" رمیش پانڈے مدعی بنام اسٹیٹ آف اتر پردیش ، اور ۳۰ دوسرے مدعا علیہم یہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے ، جسے ہری شنکر دوبے منصف

صدر فیض آباد نے مستقل مقدمہ نمبر ۲/۵۰ کے سلسلہ میں ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کو صادر کیا تھا۔

مقدمہ کے حقائق مختصر طور پر اس طرح ہیں کہ مقدمہ ۲، ایف اے ۵/ میں مدعی نے ایک درخواست (۴۲۲ سی) اس مطلب کی گذاری کہ مدعی اور ہندو قوم کے دیگر افراد عام طور سے شری بھگوان رام چندر جی کی مورتی کی پوجا اور درشن کرتے ہیں، اسکے علاوہ وہ ان مورتیوں کی بھی پوجا کرتے ہیں جو اس مقدمہ کی اراضی سے متعلق ہیں، تو مدعی علیہم ۶ تا ۹ کو یہ ہدایت کی جانی چاہیئے کہ وہ مذکورہ جگہ کے داخلہ کے دروازہ کو بند کرکے یا وہاں تالا بندی کرکے اس پوجا اور درشن میں کسی قسم کی پابندی یا رکاوٹ نہ پیدا کریں۔

مدعا علیہم ۶ تا ۹ میں اترپردیش اسٹیٹ، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ، اور ایس، پی ہیں ان لوگوں نے یہ اعتراض نامہ داخل کیا کہ وہ عدالت کے حکم مورخہ ۱۳ار مارچ ۱۹۵۱ء کے مطابق مذکورہ مورتیوں کی پوجا میں مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، وہ صرف اس بنیاد پر درخواست کے مزاحم ہیں کہ نظم وضبط کی برقراری کے سلسلے میں ضروری اقدامات کرنے کا انھیں اختیار دیا گیا ہے اور ان کے اس حق کو کسی بھی طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔

فاضل منصف نے درخواست دہندہ کو اس کی درخواست پر کسی قسم کی دادرسی نہیں کی، حتیٰ کہ اس معاملہ میں کوئی حکم ہی صادر نہیں کیا، کیونکہ ۱۹۶۱ء کے رہنما مقدمہ نمبر ۱۲ کا ریکارڈ ہائی کورٹ کے پیش نظر ہے، اسی لئے فاضل منصف نے خود کو اس لائق نہیں پایا کہ وہ اس درخواست پر کوئی فیصلہ دے، اس کی خاص بنیاد یہ ہے کہ کوئی بھی حکم جو معاملہ میں صادر کیا جائے گا وہ رہنما مقدمہ کی فائل میں بھی جاری کیا جائیگا اور چونکہ رہنما مقدمات کی فائل دستیاب نہیں ہے، اس لئے فاضل منصف نے کوئی حکم

جاری نہیں کیا۔

یہ بات درخواست کی نامنظوری کے مترادف ہے لہذا مدعی نے موجودہ درخواست پیش کی، مدعی نے اس درخواست میں صرف مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء کے مدعا علیہم ۶ تا ۹ کو بحیثیت مخالف پارٹی کے اپنا فریق بنایا ہے۔

مدعی کہتا ہے کہ اس کو دوسرے مدعا علیہم سے کوئی شکوہ نہیں اس لئے وہ ان لوگوں کو اپنا مخالف اور محاذی بنانا نہیں چاہتا۔

اس مقدمہ میں حکم امتناعی کا جو آخری حکم جاری کیا گیا وہ ۳ر مئی سنہ ۱۹۵۱ء کا ہے اس حکم کے مطابق سول جج نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ حکم امتناعی مورخہ ۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء ترمیم شدہ ۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء نافذ رہے گا۔

۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو فاضل عدالت نے اس مفہوم کا حکم امتناعی جاری کیا کہ "فریقین کو حکم امتناعی کے ذریعہ بہر طور اس بات سے روکا جائے گا کہ وہ متنازعہ زمین کی مورتیوں کو ہٹائیں یا پوجا کے ذریعہ مداخلت کریں وغیرہ وغیرہ جیسا کہ اس وقت معمول ہے"۔ فاضل عدالت کا یہ فیصلہ آج تک قائم ہے اور مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے اس فیصلہ کی ہائی کورٹ نے بھی توثیق کر دی ہے۔

موجودہ درخواست میں صرف یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آیا مدعا علیہم کو تالا ہٹانے کی ہدایت دی جا سکتی ہے؟ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پوجا کرنے اور پجاریوں کی آزادانہ آمد و رفت میں وہی خاص رکاوٹ ہے۔

میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس، ایس پی فیض آباد کو اس معاملے میں نوٹس جاری کئے، یہ دونوں میرے سامنے عدالت میں پیش ہوئے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان دیا کہ متنازعہ جگہ پر ایستادہ مورتیاں باہر سے دیکھی جا سکتی ہیں، بیرونی پھاٹک میں پلے نہیں ہیں، خاص پھاٹک میں

ایک سلاخوں والا جنگلہ ہے اور دو دروازے اندرونی احاطہ میں ہیں ۱۹۵۰ء کے مقدمہ نمبر ۲ کے نقشہ نظری پیپر نمبر ۱۳۶/ ۵ میں ان دروازوں کو حروف 'پی' اور 'او' کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے، ان دونوں پھاٹکوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ ان کو (ڈپٹی مجسٹریٹ) یہ علم نہیں ہے کہ یہ تالے کب لگائے گئے اور کس نے ان کو لگانے کا حکم دیا اس معاملہ کا کوئی ریکارڈ بھی دستیاب نہیں ہے کہ کس نے "او" اور "پی" پھاٹکوں پر تالے ڈالنے کا حکم دیا۔

پجاری کو پوجا کرنے اور بھوگ کرنے کے لئے پھاٹک 'او' سے اندر جانے کی اجازت ہے، پھاٹک 'او' کا تالا نہیں کھلا ہے، نقشہ میں جو مورتیاں دکھائی گئی ہیں ان کے علاوہ اندر کے حصہ میں اور بھی مورتیاں ہیں، جب وہاں پوجا کی جاتی ہے تو ان مورتیوں میں سے اکثر کو باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مہنت کے علاوہ دوسرے افراد بھی سٹی مجسٹریٹ کی اجازت سے مذکورہ جگہ جا سکتے ہیں۔

گذشتہ ۳۵ یا ۳۶ سال سے دوسرے فرقہ کے کسی شخص نے وہاں نماز ادا نہیں کی ہے، ان کو اس جگہ جانے کی بھی اجازت نہیں ہے، نقشہ کی لائن (ایچ اور جے) کے باہری جانب مورتیاں ہیں، اور بیرونی دیوار کے اندرون میں چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور ان کی پوجا کی جاتی ہے، اس مقام پر ۱۹۵۱ء سے اب تک نظم و ضبط کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا نہ ہی کوئی فساد ہوا، پھاٹک 'او' اور 'پی' پر تالے صرف اسلئے پڑے ہیں کہ اندر رکھی ہوئی مورتیوں کی دیکھ بھال ہو سکے کہ وہ کہیں غائب تو نہیں کر دی گئی ہیں، اور یہ تالے بھی عدالت کے حکم امتناعی کے احترام کے طور پر لگے ہیں۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مزید کہتے ہیں کہ مورتیوں کی حفاظت کے لئے پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کو بند رکھنے کے علاوہ مورتیوں کی حفاظت اور نظم و ضبط کو

برقراری کے لئے دوسرے اور طریقے بھی ہیں، وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ اگر پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کے تالوں کو کھول بھی دیا جائے تو متنازعہ جگہ پر رکھی ہوئی مورتیوں کی حفاظت اور امن کے قیام کے لئے دوسرے طریقے ہیں۔

ایس ایس پی فیض آباد شری پرم ویر سنگھ سے بھی بیان لیا گیا، انھوں نے بتایا کہ پولیس فورس متنازعہ جگہ پر برقرار ہے، وہ اجودھیا کے دوسرے مندروں پر بھی نظم وضبط اور امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کو تعینات کر دیتے ہیں، خصوصاً تیوہاروں کے موقع پر انھوں نے یہ بیان دیا کہ خواہ پھاٹک 'پی' اور 'او' کے تالے کھولے جائیں یا بند رکھے جائیں نظم وضبط اور امن کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا ہے، نظم وضبط اور مذکورہ جگہ کی حفاظت صرف پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کے تالوں پر ہی منحصر نہیں ہے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا مندرجہ ذیل بیان نہایت برمحل ہے۔

"او، اور پی، گیٹ پر تالا بند کرنے کے علاوہ اور بھی طریقہ سے مورتیوں کی سُرکشا (حفاظت) کی بیوستھا (تدبیر) کی جا سکتی ہے، اور شانتی بیوستھا (امن کی تدبیر) قائم رکھی جا سکتی ہے۔"

اسی طرح ایس ایس پی فیض آباد کا یہ بیان سارے معاملہ کو قطعی طور پر طے کر دیتا ہے۔

"او، اور پی، پر تالے رہیں یا نہ رہیں میں وہاں کی سُرکشا بیوستھا سپھلتا پوروک (حفاظت کا انتظام کامیابی کے ساتھ) کر سکتا ہوں، وہاں کی سُرکشا او، د پی، گیٹ کے تالوں سے ہی نہیں ہے، مجھے آوشکتا (ضرورت) پڑنے پر وہاں سُرکشا قائم کرنے کا ادھیکار (اختیار) رہنا چاہیئے۔"

تو یہ واضح ہوا کہ مورتیوں کی حفاظت یا نظم وضبط اور امن کے قیام کے لئے

'پی' اور 'او' پھاٹکوں پر تالے لگانا ضروری نہیں اس سے غیر ضروری طور پر مدعی اور اس کے فرقہ کے دوسرے لوگوں کو اشتعال دلانا ظاہر ہوتا ہے، یہ ضرورت بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ مورتیوں اور عقید تمندوں کے درمیان ایک مصنوعی رکاوٹ پیدا کی جائے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متصادم فریق گذشتہ ۳۵ سالوں سے غیر فیصلہ شدہ صورت حال کے اسیر ہیں، کچھ لوگوں نے زمانہ کے کسی واقعہ کی بنا پر اپنی عقل و دانش سے یہ خیال کیا کہ 'پی'، 'او' پھاٹکوں پر تالے لگا دیئے جائیں لیکن تب سے کسی نے یہ پرواہ نہیں کی کہ دیکھئے آیا ان تالوں کے بدستور بند رہنے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں، فریقین کی سماعت گذاری کے بعد واضح ہوتا ہے کہ تالے کھولے جانے کی صورت میں اور یاتریوں کے لئے درشن اور پوجا کرنے کی اجازت دینے کے بعد دوسرے فرقہ یعنی مسلمانوں کی جمعیت حدِ تصوّر تک بھی متاثر نہیں ہوتی۔

یہ امر غیر متنازعہ ہے کہ مذکورہ جگہ فی الحال عدالت کے عمل دخل میں ہے، اور گذشتہ ۳۵ سال سے ہندو پوجا کرنے کا محدود حق رکھتے چلے آئے ہیں، جیسا کہ عدالت کے احکام ۱۳۵ سنہ ۱۹۵۱ء (۱۹ رجنوری سنہ ۱۹۵۰ء، ۳۰ رمارچ سنہ ۱۹۵۱ء) سے ظاہر ہے اگر ہندو ایک محدود پابندی کے ساتھ گذشتہ ۳۵ برسوں سے پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں تو اگر 'او' اور 'پی' پھاٹکوں کے تالے کھول دیئے جائیں تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑیگا

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے میرے سامنے بیان دیا کہ مسلم فرقہ کے افراد کو متنازعہ جگہ پر نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر حالات یہی ہیں تو پھر تالوں کے ہٹا دینے کی نتیجہ میں نظم و ضبط کے مسائل کھڑے ہونے کی نوبت نہیں آئے گی، یہ قطعی طور پر جائے نزاعی کے اندر کا معاملہ ہے۔ موجودہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے جو ایسی درخواست پر دیا گیا ہے جو آرڈر ۳۹ کے مفہوم میں اسی طرح آتی ہے جیسے کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ایس/۱۱۵ کے تحت آتی ہے۔

تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس ایس پی فیض آباد کے ان مثبت بیانات کے بعد کہ نظم وضبط کی صورت حال دوسرے ذرائع سے بھی قابو میں رکھی جاسکتی ہیں اور اس کے لئے ان دروازوں پر تالے بند رکھنا ضروری نہیں ہے ان تالوں کا بدستور بند رہنا صحیح نہیں۔

لہٰذا اس اپیل میں ایک وزن ہے، یہ اپیل منظور کی جاتی ہے اور مدعا علیہم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ فی الفور پھاٹک 'او، اور پی' کے تالے کھول دیں وہ مدعی یا اس کے فرقہ کے افراد پر درشن کرنے پوجا کرنے میں کسی طرح مانع یا مزاحم نہ ہوں اور نہ رکاوٹ ڈالیں۔

بہر کیف مدعا علیہم نظم وضبط کو قابو میں رکھنے کے لئے اور یاتریوں کے داخلہ کی باقاعدگی کے لئے حالات کے تحت کسی بھی آزادانہ اقدام کے مجاز ہوں گے، اپیل کے مصارف مقدمہ کے فیصلہ کے تابع ہوں گے۔" [1]

مسلمانوں کی طرف سے اس فیصلہ کے خلاف تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے یہ کہہ کر انھیں رد کر دیا کہ یہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے تعلق رکھتا ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

فیصلہ کے فوراً بعد ۵ بج کر ۱۹ منٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہزاروں ہندو جو پہلے سے وہاں جمع تھے پوجا پاٹ کے لئے اسی وقت مسجد میں داخل ہو گئے، اس طرح سے ۴۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کر دی گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اس فیصلہ پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۵ء تک کے مقدمہ میں بابری

---

[1] مسلم انڈیا انگریزی مارچ ۱۹۸۶ء) انگریزی متن کا ترجمہ از بابری مسجد پس منظر وپیش منظر ص ۱۱۰ تا ۱۱۶

مسجد کو مسجد ہی تسلیم کیا گیا، ۱۸۶۰ء میں یہ باضابطہ مسجد کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرائی گئی، سنی سینٹرل وقف بورڈ کے ماتحت یہ مسجد مسجد ہی کی حیثیت سے قانوناً کردی گئی، اور مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ تالا بند ہونے سے پہلے اس میں مسلمان برابر نمازیں ادا کرتے رہے ہیں، فاضل جج نے ان باتوں کو بالکل نظر انداز کیسے کردیا۔

پھر قانونی طور پر یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ فیض آباد کے منصف صدر کے فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی، مگر خلاف قانون اپیل کی گئی، مزید برآں اپیل کرنے والا پہلے کسی مقدمہ میں مدعی بھی نہیں تھا، ان قانونی خامیوں کے باوجود اس کی درخواست ڈسٹرکٹ جج نے اپنی عدالت میں داخل کرلی پھر اس مقدمہ میں جو مدعا علیہم تھے ان کی سماعت کے لئے انھیں نہیں بلایا گیا، حتیٰ کہ سنی سینٹرل بورڈ کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں دیا گیا، اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جب یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش ہے تو اس کی ماتحت عدالت کو اسکی سماعت کا قانونی طور پر کوئی حق نہیں تھا۔

علاوہ ازیں یہ پہلو بھی کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس مقدمہ کا مدعی رمیش پانڈے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندر کمار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے، ایم پانڈے اور سرکاری وکیل ویریشوری دویدی سب کے سب پنڈت برادری ہی سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس میں جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے سے معلوم تھا۔

اسی کا شہر، وہی مدعی، وہی منصف
ہمیں یقیں تھا ہمارا قصور نکلے گا

اس مقدمہ کا یہ رخ بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے اور اجودھیا فیض آباد میں پی۔اے۔سی دن کے دو بجے ہی لگادی

گئی جس کا گشت مسلمانوں کے محلوں میں شروع ہوگیا، نیز فیصلہ سے پہلے عدالت کو بھی پی، اے، سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا، فیصلہ سے قبل یہ تیاریاں غمازی کر رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس یک طرفہ فیصلہ نے ہندو مسلم کے درمیان ایک ایسی خلیج قائم کر دی ہے اور فرقہ واریت کے رجحان کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ اس کے سامنے ہمارے سیاسی رہنماؤں کا نعرۂ سیکولر بے حقیقت ہوگیا ہے، جس کے بُرے ثمرات کا مزہ صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر شہری کو چکھنا پڑے گا۔ ملک سے ہمدردی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اربابِ حکومت، سیاسی رہنما اور ملک کے دانشور اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

مسجد شاہجہانی

عہد شاہ جہانی کے صوبیدار "فدائی خان" نے یہ مسجد لبِ سرجو ایک پرفضا مقام میں تعمیر کرائی تھی جو اپنی شان و شوکت اور بلندی میں "اجودھیا" کی تمام مسجدوں پر فوقیت رکھتی تھی، چونکہ یہ عالی شان مسجد محلہ "سورگ دواری" میں واقع تھی، اس لئے عام طور پر "مسجد سورگ دواری" کے نام سے معروف ہے۔ مولوی عبدالکریم لکھتے ہیں کہ اس کے مینار اس قدر بلند تھے کہ سات کوس (چودہ میل) کے فاصلے سے نظر آتے تھے۔ لہ

بیسویں صدی کے ربع اول تک اس کے دونوں مینار موجود تھے۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں اجودھیا کے چیرمین "پریہ دت" نے شمالی مینار کو اس کے مخدوش ہو جانے کی بنار پر منہدم کرا دیا، یہ مسجد اس وقت برائے نام ہی باقی بچی ہے، کیونکہ اس کی پچھلی دیوار اور ایک مینار کے علاوہ بقیہ سارا حصہ زمیں بوس ہو چکا ہے، انتظامیہ کی جانب سے اجودھیا کی کسی بھی مسجد کی مرمت یا جدید تعمیر کی اجازت نہیں ہے، اس لئے چند سالوں کے بعد اس کے باقی آثار بھی ناپید ہو جائیں گے۔

لہ گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۲۴ - ۲۵ -

اس مسجد سے ملحق جانب جنوب میں ایک "مدرسہ" بھی تھا جس میں "فدائی خان" کے مرشد "مولانا شاہ ابراہیم" درس دیا کرتے تھے، مسجد و مدرسہ کے مصارف کے لئے "دربار شاہجہانی" سے "شاہ ابراہیم مرحوم" کے نام ایک فرمان معافی صادر ہوا تھا، جس کی اراضی گونڈہ میں تھی، شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کی ناخلف اولاد نے ساری جائداد ضائع کردی بروایت "مولوی عبدالکریم" شیخ ابراہیم مرحوم کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا جو مدرسہ کے چار کمروں پر مشتمل تھا، لیکن شاہ صاحب کے اخلاف نے اپنی جہالت و غربت کی بناء پر اسے کوڑیوں کے دام فروخت کردیا۔ اب نہ مدرسہ ہے اور نہ کتب خانہ، البتہ شاہ ابراہیم صاحب کا نہایت عظیم الشان و خوش نما مقبرہ نہایت اچھی حالت میں موجود ہے، جس میں شاہ صاحب کے تبرکات بھی محفوظ ہیں، آج سے ساٹھ ستر سال پہلے تک مدرسہ کے تھوڑے بہت آثار باقی تھے مگر اب وہ بھی نیست و نابود ہو گئے ہیں۔

اس مسجد کی داستان بڑی کرب انگیز، اور عبرت خیز ہے، عہد عالمگیری کی یہ قناتی مسجد آج سے صدیوں پہلے مذہبی تعصب کے ہاتھوں تباہ کی جا چکی ہیں، البتہ تاریخ کے صفحات اب بھی اُس گراں قدر امانت کو محفوظ کئے ہوئے ہیں، یہ مرحوم مسجد اورنگ زیبؒ کے دور میں ایک ٹیلے پر تعمیر کی گئی تھی، جو اس قطعۂ اراضی کا مشرقی حصہ تھا جسے شہنشاہ اکبر نے اپنے زمانۂ حکومت میں "اکبر پور" کے نام سے موسوم کیا تھا[1] اور ہندوؤں میں یہ جگہ "رام کوٹ" کے نام سے مشہور تھی، اور اسی کو آج کل "ہنومان گڑھی" کہا جاتا ہے۔ اکبر نے اس اراضی کو اس وقت کے مشائخ و علماء کی قبرستان کے واسطے وقف کر دیا تھا، چنانچہ ایک طویل زمانہ تک یہ بلند و وسیع میدان قبرستان کے طور پر مسلمانوں کے استعمال میں رہا۔ مولوی عبدالکریم اودھی متوفی ۱۳۰۸ھ بیان کرتے ہیں کہ "اس میں ہزاروں پختہ قبریں تھیں، اس مشرقی ٹیلہ کے بالمقابل پچھم سمت میں بھی اسی طرح کا ایک بلند و وسیع ٹیلہ تھا (اسی پر بابری مسجد واقع ہے) "بابری مسجد" یعنی مغربی ٹیلہ اور مشرقی ٹیلے کے درمیانی حصہ میں قاضی عبدالحفیظ از اولاد شیخ قطب الدین رئیس "محلہ شیخانہ" کا تکیہ تھا جس میں اس

---

[1] گم گشتہ حالات اجودھیا۔ ص ۴۰۔

خاندان کی قبریں تھیں، لیکن بعد میں ان کی ناخلف اولاد نے اس تکیہ (قبرستان) کو مقامی مراٹھوں کو تمباکو کی کاشت کرنے کے لئے کرایہ پر دیدیا، انھوں نے قبروں کو کھود کر اس کی اینٹیں فروخت کردیں اور زمین کو کاشت کے قابل بنانے کے لئے ہموار کردیا، پھر کچھ دنوں کے بعد پورے تکیہ کو بیراگیوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ چنانچہ "بابری مسجد" سے "رنگ محل" تک جتنے مندر اور استھان ہیں، وہ سب اسی اراضی پر ہیں اور میرے (مولوی عبدالکریم) سامنے تعمیر ہوئے ہیں[۱] ان دونوں ٹیلوں کے علاوہ شمال وجنوب میں بھی دو ٹیلے تھے اور ان پر بھی کچی پکی بہت سی قبریں تھیں[۲] بابری اور عالمگیری مسجدوں کے علاوہ اس جگہ کوئی بھی عمارت نہیں تھی، موجودہ ساری عمارتیں بعد کی تعمیر ہیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے دروازے پر سنگِ موسیٰ کی ایک تختی نصب تھی جس پر لفظ "اللّٰہ" کندہ تھا، اسی طرح کی ایک تختی محراب میں بھی تھی، چونکہ مسجد آبادی سے دور سنسان جگہ میں واقع تھی اسلئے "قاضی عاقل" اودھی نے اس کی نگہداشت، صفائی اور اذان ونماز کے لئے "یاقی" نامی ایک شخص کو مقرر کردیا تھا جو اسی مسجد میں رہتا تھا[۳]

مسجد کی حیثیت بدلنے کی کوشش

ریاست اودھ کے بانی، نواب برہان الملک محمد امین سعادت خاں نیشاپوری" متوفی ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء کے زمانہ میں کچھ بیراگیوں نے مسجد میں توڑ پھوڑ کرکے اس کی ہیئت بدل دی اور اس میں ایک مورتی بھی رکھ دی، نواب سعادت خان کو جب اس شرانگیزی کی اطلاع ملی تو انھوں نے فوج بھیج کر مسجد کو مورتی سے پاک کرایا اور حسب سابق اس کی تعمیر بھی کرادی، نیز ان شرپسند بیراگیوں کو

---

[۱] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۴۰۔ [۲] ایضاً، ص ۴۲۔ [۳] حدیقۃ الشہداء، ص ۵۔

واجبی سزا بھی دی۔[۱]

مسجد کے قریب مندر اوپر بیان شدہ تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ مذکورہ چاروں ٹیلے اور ان کے درمیان کی زمین شہنشاہ اکبر کے جاری کردہ فرمان کے مطابق مسلمانوں کے قبضے میں تھی جسے وہ قبرستان کے طور پر استعمال کرتے تھے، چنانچہ نواب شجاع الدولہ (جلال الدین حیدر) متوفی ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء کے ابتدائی دور تک بغیر کسی مزاحمت و شرکت کے یہ سارا کا سارا قطعہ اراضی مسلمانوں ہی کے تصرف میں رہا، بعد میں راجہ ہمت بہادر انوپ گیر اور امراؤ گیر دونوں بھائیوں (جو نواب شجاع الدولہ کے سر چڑھے مصاحبوں میں سے تھے جن کی خاطرداری و دلجوئی وہ بہرحال ضروری سمجھتے تھے جس کی تفصیل عماد السعادت تفضیح الغافلین، تاریخ اودھ وغیرہ میں موجود ہے) کی سفارش پر نواب نے مشرقی ٹیلے پر ایک کوٹھری کی جگہ "گوشائیں" کو دیدی، جس پر انھوں نے ایک خس پوش عمارت بنا کر اس میں ہنومان کی مورتی رکھ دی۔[۲] لیکن مسجد اور اس کے مؤذن سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا بلکہ اس کو خوش رکھنے کی غرض سے مورتی پر جو چڑھاوا آتا تھا اس میں مؤذن کا بھی حصہ لگاتے تھے، ایک عرصہ تک اس خس پوش کٹیا پر گوشائیں قابض رہے، بعد میں ناگوں نے اپنا قبضہ جمانے کے لئے ان سے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں دونوں حریفوں کے درمیان خوں ریز جھڑپ ہوئی اور بالآخر ناگوں نے بزور طاقت گوشائیوں سے اسے چھین لیا[۳] اور اس خس پوش کٹیا کی جگہ پختہ مندر تعمیر کر لیا، اور اسی کے ساتھ مسجد کے منبر وغیرہ کو بھی توڑ ڈالا، ان کی اس تخریب کاری اور توڑ پھوڑ پر "قاضی حبیب اللہ" نے ناگوں کی گرفت کی جس پر انھوں نے ایک تحریری عہد کیا کہ آئندہ مسجد کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں

---

[۱] تواریخ اودھ ج ۲ ص ۱۱۰۔ [۲] گم گشتہ حالات اجودھیا، و حدیقۃ الشہدا ص ۵۔ [۳] ایضاً ص ۴۲

کریں گے، قاضی صاحب نے ان سے اس عہد لینے کے بعد مسجد کی مرمت کرادی اور بغرض تحفظ ایک مؤذن اس میں مقرر کر دیا، کیونکہ پہلے مؤذن پاتی شاہ کا انتقال ہوگیا تھا۔[1]

ہنومان گڑھی کی تعمیر اور مسجد کا انہدام

نواب واجد علی شاہ معزول ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء کے عہد سلطنت میں جب اس علاقہ کی نظامت راجہ درشن سنگھ بہادر کے سپرد ہوئی جو مذہبی تعصب اور مسلم دشمنی میں اپنی نظیر آپ تھے، تو انھوں نے ان مذکورہ چاروں ٹیلوں کے گرد چہار دیواری کھنچوا کر اس جگہ کو "ہنومان گڑھی" کے نام سے موسوم کر دیا، اور اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد و رفت پر پابندی لگوا دی، اس وقت بھی عالمگیری مسجد کی مغربی دیوار باقی تھی جس کے محراب میں سنگ موسیٰ پر لفظ "اللہ" کھدا ہوا تھا، لیکن خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اس پتھر کو وہاں سے کھود کر ناپید کر دیا گیا اور مسجد کی دیوار سے چپاں کر کے ایک دوسری دیوار بنا دی گئی تاکہ مسجد کا کوئی نام و نشان باقی نہ بچے۔[2]

مسجد مذکور کی مغربی دیوار سے چند گز فاصلے پر "ہنومان" کا وہ مندر تھا جس کی جگہ "انوپ گیر، امراؤ گیر کی سفارش پر نواب شجاع الدولہ نے گوشائیوں کو دی تھی جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

مسجد کی بازیابی کی پہلی جدوجہد اور اندوہناک ناکامی

"راجہ درشن سنگھ" کے اس جارحانہ رویہ سے بیراگیوں کو حوصلہ ملا، اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے "عالمگیری مسجد" کے نام و نشان مٹا ڈالے بلکہ شہر اجودھیا کی دیگر مسجدوں کی بھی بے حرمتی کی اور انھیں نقصان پہونچایا۔[3] ان ناپسندیدہ حالات سے متاثر ہو کر، غلام حسین شاہ اودھی" نے ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء

---

[1] حدیقۃ الشہداء، ص ۶۔ [2] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۴۴۔ [3] تاریخ اودھ ج ۴ ص ۹ و امیر علی شہید اور معرکہ ہنومان گڑھی عظمت علی کاکوروی، ص ۱۱۔

میں نواب واجد علی شاہ کی خدمت میں اجودھیا کے موجودہ حالات سے متعلق ایک عرضداشت پیش کی، مگر نواب نے اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، نوابان اودھ کے قدیمی نمک خوار مرزا رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔

"الغرض بارہ سو اکہتر ہجری عہد دولت" واجد علی شاہ" میں "شاہ غلام حسین" نام فقیر نے نواب کو عرضی دی، توہین اسلام کی اطلاع کی یہاں کسی نے نہ سنا۔"[1]

"واجد علی شاہ" کی طرف سے ناامید ہوجانے پر" شاہ صاحب" فیض آباد آئے اور مرزا منعم بیگ کوتوال اور مرزا علی اعلیٰ منصرم ریاست پچھم راٹھ سے انصاف کی درخواست کی، لیکن انھیں بھی مخالف ہی پایا، آخر کار ہر طرف سے مایوس ہو کر بہ مشورہ "مولوی محمد صالح" مسجد عالمگیری کی بازیابی کے لئے چند ہم خیال افراد کے ہمراہ عازم اجودھیا ہوئے، دادخواہوں کا یہ قافلہ ابھی موضع "رونا ہی" تک ہی پہونچا تھا کہ مرزا علی اعلیٰ" نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا اور چند افراد جو کسی اور راستے سے اجودھیا پہونچ گئے تھے انھیں نائب کوتوال "مرزا نثار حسین" اور کپتان الگزنڈر آر نے شہر بدر کرا دیا۔

"شاہ غلام حسین کی اس پیش قدمی کی اطلاع جب" نواب واجد علی شاہ" کو ملی تو تقاضائے وقت کے پیش نظر مسجد کی تحقیقات کے لئے "آغا علی خان" ناظم اودھ، اور "مرزا منعم بیگ" کوتوال شہر کے نام پرچہ جاری کیا[2]۔ "شاہ غلام حسین" کو اس تازہ صورت حال سے کچھ امید بندھی، اور وہ اپنے رفقاء کی معیت میں اجودھیا آکر "بابری مسجد" میں فروکش ہو گئے، کپتان الگزنڈر آر، مرزا علی اعلیٰ اور کوتوال شہر مرزا منعم بیگ نے شہر میں عام اعلان کرادیا کہ کوئی بھی مسلمان "غلام حسین شاہ" کی اس

---

[1] فسانۂ عبرت، ص ۱۲۱۔ [2] تاریخ اودھ نجم الغنی خاں رام پوری ج ۴، ص ۹۱۔

معاملہ میں اعانت و امداد نہ کرے ورنہ جان سے مارا جائے گا، گھر لٹے گا، سر اتارا جائے گا جس سے خوف زدہ ہو کر اجودھیا کے مسلمان شاہ صاحب کے شریک کار نہ ہوئے[1] دوسری طرف بیراگیوں کی مدد کو راجہ مان سنگھ، راجہ کشن دت پانڈے اور دیار کے دیگر ہندو زمیندار وغیرہ دس ہزار کی تعداد میں اجودھیا پہونچ گئے، اور ہنومان گڑھی کو اپنا مرکز بنایا۔ اور دریائے گھاگھرا کے گھاٹ کو بند کر دیا تاکہ اس راہ سے باہر کے مسلمان یہاں نہ پہونچ سکیں[2] ۱۲ ر ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء جمعہ کو تقریباً دو سو کی تعداد میں مسلمان بغرض نماز جمعہ بابری مسجد آئے، مسلمانوں کے اس اجتماع کی اطلاع پر ہنومان گڑھی میں اکٹھا ہندوؤں نے ہزاروں کی تعداد میں آکر "بابری مسجد" کا محاصرہ کر لیا، مسجد میں موجود مسلمانوں نے بھی (جن کی تعداد پورے پونے تین سو بھی نہیں تھی) مرتا کیا نہ کرتا کے بموجب اپنی مدافعت کے لئے کمر ہمت کس لی۔ کپتان الگزنڈر آر اور کوتوال منعم خاں کے سپاہیوں نے آکر بیچ بچاؤ کرایا، اور بات تو تو، میں میں سے آگے نہ بڑھی، لیکن اس ہنگامہ آرائی کی بنا پر مسلمانوں کو نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع نہ ملا جمعہ کا سارا وقت اس فتنہ کی نذر ہو گیا، دوسرے دن یعنی ۱۳ ر ذی قعدہ سنیچر کو کپتان کی مدد کے لئے لکھنؤ سے "جان ہرسی" انگریز اپنی فوج کے ساتھ اجودھیا پہنچ گیا۔ چونکہ "الگزنڈر آر" اور "بیراگیوں" کے درمیان خفیہ ساز باز تھی اس لئے اس نئی فوج کے آجانے سے بیراگیوں کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ "جان ہرسی" نے "بابری مسجد" کا معائنہ کیا، اس میں دروازہ نہیں تھا، اس نے "غلام حسین" اور ان کے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ مسجد میں دروازہ کا ہونا مصلحت وقت کے پیش نظر ضروری ہے اس کی وجہ سے مسجد میں مقیم افراد محفوظ ہو جائیں گے، اس کے مشورہ کے مطابق "شاہ صاحب" نے دروازہ کی جوڑی لانے کی غرض سے دو آدمی بھیج دیئے، یہ دونوں

---

[1] حدیقۃ الشہداء مرزا جان۔ ص ۱۴۔ [2] تاریخ اودھ مولوی نجم الغنی ج ۴، ص ۹۲۔

محلہ بیگم پورہ سے ایک جوڑی خرید کر لا رہے تھے۔ راستے میں "ہنومان گڑھی" کے شرپسندوں نے ان پر حملہ کر دیا، اس ناگہانی حملہ کی اطلاع مسجد میں مقیم مسلمانوں کو ملی تو ان کی مدد کے لئے چار پانچ افراد موقع پر پہنچ گئے بالآخر جانبین میں جنگ چھڑ گئی، بیراگیوں کے معاونین سیکڑوں کی تعداد میں تھے اور مسلمان صرف سات تھے، لیکن انھوں نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ بلوائیوں کے چھکے چھوٹ گئے وہ میدان چھوڑ کر "ہنومان گڑھی" کی جانب بھاگ پڑے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا مگر وہ بھاگ کر ہنومان گڑھی میں چھپ گئے، مسجد میں مقیم لوگوں کو جب اس مقابلہ آرائی کی خبر ملی تو وہ بھی ہتھیار سنبھال کر ہنومان گڑھی پہونچ گئے، چنانچہ ہنومان گڑھی کے دروازے پر خوں ریز مڈبھیڑ ہوئی، اس مقابلہ آرائی کے دوران موسلا دھار بارش ہونے لگی جس کی وجہ سے جنگ کا یہ سلسلہ موقوف ہو گیا، بلوائی "ہنومان گڑھی" میں پناہ گزیں ہو گئے، اور مسلمان "بابری مسجد" لوٹ آئے، اس ہنگامہ آرائی میں سات مسلمان شہید ہوئے، بلوائیوں کے مقتولین کتنے تھے اس کی تصریح نہیں ملی، رجب علی بیگ سرور نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ہندوں نے اپنے کشتے جلائے کچھ دریا میں بہائے"۔

مسلمان جب "بابری مسجد" میں آ گئے تو "جان ہرسی" اور "الگزنڈر آر" دونوں انگریز افسروں نے ان کے پاس آ کر بیک زبان کہا کہ آپ لوگ اپنے ہتھیار کھول کر اطمینان کے ساتھ مسجد میں رہیں، تا فیصلہ آپ لوگوں سے کوئی کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرے گا" شاہ غلام حسین اور ان کے ساتھی ان افسروں کی درپردہ سازش سے بالکل بے خبر تھے، اس لئے ان کی باتوں میں آ گئے اور اپنے اپنے ہتھیار اتار دیئے اسی وقت ایک شخص کھانا لے کر آ گیا، چونکہ مسلمان دو دن کے بھوکے تھے اور انگریز افسروں نے پورا اطمینان بھی دلا دیا تھا اس لئے سب لوگ خاطر جمع ہو کر صحن مسجد میں

کھانے میں مصروف ہو گئے، مسلمانوں کو اس طرح مطمئن و مشغول کر کے یہ یہ دونوں انگریز اور نثار حسین نائب کوتوال اپنے اپنے سپاہیوں کو لے کر مسجد سے کافی فاصلے پر ایک درخت کے سائے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے یہاں سے ہٹتے ہی ہزاروں کی تعداد میں بلوائیوں نے مسجد پر یلغار کر دی اور ساتھ ہی مسجد سے متصل ایک مکان کی چھت سے مسلمانوں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ اس غیر متوقع اور اچانک حملے کی بنا پر انھیں سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ پھر بندوقوں کی گولیاں اوپر سے آ رہی تھیں اور یہ لوگ نیچے کھلے صحن میں تھے اس لئے نہایت کارگر ہوئیں، چنانچہ صحن مسجد میں موجود سارے مسلمان زخمی ہو کر وہیں ڈھیر ہو گئے، بعد ازاں بے رحم بلوائیوں نے مسجد میں گھس کر تڑپتے ہوئے مسلمانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر دیا، صرف غلام حسین اور ان کے ہمراہ ایک اور شخص کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو سکے ورنہ سارے ہی مسلمان جن کی تعداد دو سو انہتر بیان کی جاتی ہے، صحن مسجد میں شہید کر دئے گئے۔

ان مظلوم شہدار کی تعداد میں تذکرہ نویسوں کے اقوال مختلف ہیں۔ رجب علی سرور، فسانۂ عبرت میں، عظمت علی کاکوروی، امیر علی شہید اور ہنومان گڑھی میں "مرزا محمد جان" حدیقۃ الشہدا میں، اور مولوی عبد الکریم اودھی نے اپنی یادداشت میں ان کی تعداد صرف انہتر تحریر کی ہے، "منشی رام سہائے تمنا لکھنوی" افضل التواریخ میں ایک صد و سی تن (ایک سو تیس) لکھی ہے، مولوی فدا حسین، احوال و واقعات میں ایک سو پینسٹھ اور ایک سو ستر کے درمیان کی تخمینی تعداد بیان کرتے ہیں ان حضرات کے برخلاف مولوی نجم الغنی خاں رامپوری، تاریخ اودھ جلد چہارم میں اور سید کمال الدین حیدر المعروف بہ سید محمد میر نے دو سو انہتر کی صراحت کی ہے، ہم نے اسی بیان کو اختیار کیا ہے، کیونکہ اس کے راوی مرزا علی اعلیٰ منصرم بچھم راٹھ ہیں جو اس موقع پر قیام امن کے نام پر اپنے سپاہیوں کے ساتھ اجودھیا میں موجود تھے اور اپنے

ولیٔ نعمت مان سنگھ اور انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروفِ کار تھے
سید محمد میر قیصر التواریخ جلد دوم کے صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"اب زبانی مرزا علی اعلیٰ کے ہے جو مولف کتاب کے وقتِ روانگی کربلا کر اس شب خاص کربلا میں میرے پاس رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ یہ دونوں انگریز اور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور کھرنی کے نیچے جا کھڑے ہوئے ایک ساعت نہ گذری تھی کہ بیراگی ہزاروں گول سے نعرہ مارتے آکر مسجد کو گھیر لیا اور رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے پر چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں کو گولیاں برسانا شروع کیا اور مسجد میں آکر دوسو انہتر آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، مسجد میں لہو بہنے لگا اور قرآن شریف کو جو اکثروں کے حمائل تھا پرزے پرزے کر کے معاذ اللہ پانوں سے روندا اور جلا دیا"

قرین قیاس یہ ہے کہ حدیقۃ الشہدا، امیر علی اور معرکۂ ہنومان گڑھی وغیرہ میں سے کسی ایک میں سہو کاتب سے دوصد کی عدد لکھنے سے رہ گئی، بعد میں اسی غلطی کے ساتھ دوسروں نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے نقل کر دیا

ان بیدردوں نے نہتھے مظلوموں کی جان لینے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کے گلے میں حمائل قرآن مقدس کے اٹھارہ نسخوں کو پھاڑ کر پیروں تلے روندا پھر انھیں جلا کر ان کی راکھ ہواؤں کی نذر کر دی، مسجد کی بھی دل کھول کر بے حرمتی کی، صحن مسجد کا وہ آہنی کٹہرا جو ابھی دو سال پہلے نواب واجد علی کے حکم سے نصب کیا گیا تھا اسے توڑ ڈالا، مسجد کی دیواروں کو بندوق کی گولیوں سے چھلنی کر دیا، صحن مسجد میں بیٹھ کر "موہن بھوگ" کھایا، اور آخر میں شہیدوں کی لاشوں کو روندتے د گچلتے

اپنے اپنے گھروں کی راہ لی[1]

دن کی روشنی میں بربریت کا یہ ننگا ناچ ہوتا رہا اور امن و امان کے محافظ مسٹر جان ہرسی، الگزنڈر آر اور اسلام کے نام لیوا مرزا علی اعلیٰ و نثار حسین نائب کوتوال تماشائی بنے کھڑے دیکھتے رہے، شہدائے کرام کی لاشیں اسی طرح بے گور و کفن مسجد کے صحن میں پڑی رہیں، دوسرے دن نثار حسین کوتوال کو کچھ غیرت آئی اور اس نے بابری مسجد سے متصل ایک گڑھا کھود کر سب کو ایک ساتھ اس میں دفن کر دیا۔ پھر انگریزوں اور بلوائیوں کے حق نمک خواری کو ادا کرنے کے لئے بالکل خلاف واقعہ اخبار نویس سے پرچہ لکھوا دیا گیا کہ ہندو بے قصور تھے، مسلمان ہنومان گڑھی لوٹنے آئے تھے جس کی وجہ سے یہ فساد برپا ہوا، الٹی گنگا بہنے کی مثل ایسے ہی موقع کے لئے کہی گئی ہے۔

شاہ غلام حسین اودھی کی اس تحریک کو بزور طاقت انتہائی بیدردی کے ساتھ کچل دینے کے بعد اس ظلم محض پر پردہ ڈالنے کی غرض سے ریاست کے وزیر نواب علی نقی خاں اور ان کے ہم مقصد حکام ریاست نے یہ اعلان کیا کہ مسجد عالمگیری کی تحقیق کے لئے ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا جا رہا ہے، اور اگر ہنومان گڑھی میں مسجد کا وجود ثابت ہو گیا تو مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی اور مسجد کو از سر نو سرکاری خرچ پر تعمیر کرا دیا جائے گا۔ اس اعلان کے مطابق مولوی نہال الدین کاکوروی کو ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ کو اجودھیا بھیجا گیا اور انھیں مامور کیا گیا کہ مولوی حفیظ اللہ فرنگی محلی داروغہ عدالتِ دیوانی فیض آباد کے تعاون سے تحقیق حال کر کے اپنی رپورٹ سے مطلع کریں۔ مولوی نہال الدین نے حسب حکم یہاں آکر مولوی حفیظ اللہ

---

[1] یہ ساری تفصیلات باختلاف الفاظ قیصر التواریخ جلد دوم، تاریخ اودھ جلد چہارم، افضل التواریخ حدیقۃ الشہداء، فسانۂ عبرت، سید امیر علی اور معرکۂ ہنومان گڑھی اور احوال و واقعات میں موجود ہیں

موصوف کے اشتراک سے مسجد متنازعہ کے سلسلے میں پوری جانسوزی اور حزم واحتیاط کے ساتھ صحیح صورت حال کی تحقیق وتفتیش کی، چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ انصاف پسند ہندوؤں نے بھی مسجد کے وجود کی شہادتیں دیں، علاوہ ازیں قاضی یار علی نبیرہ قاضی حبیب اللہ نے کئی قدیم محضرنامے پیش کئے جن سے مسجد کا ثبوت قطعی طور پر ثابت ہو رہا تھا۔

مولوی نہال الدین نے تحقیقات مکمل کر کے اس کی رپورٹ نواب علی نقی وزیر سلطنت اودھ کی خدمت میں بھیج دی، اس رپورٹ کا پورا متن قیصر التواریخ جلد دوم کے صفحات از ۱۲ تا ۱۵ پر دیکھا جا سکتا ہے، رپورٹ میں ۳۷ ہندو، مسلمان کے بطور شہادت دستخط ہیں، بغرض اختصار اس موقع پر رپورٹ کا صرف ایک پیراگراف نقل کیا جا رہا ہے جس سے حقیقت حال کا اندازہ ہو جائیگا۔

"ہنومان گڑھی میں مسجد کو بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ اس میں نماز بھی پڑھی ہے اور محضر سیکڑوں برس کا قاضی یار علی ابن الابن قاضی حبیب اللہ کے پاس موجود ہے چنانچہ ایک ان میں سے مورخہ ۹ رذی قعدہ ۱۱۴۹ھ کا ملفوف بہ کیفیت ہے" [۱]

اس تحقیقی رپورٹ کے مطابق کارروائی کرنے کی بجائے یہ شوشہ چھوڑ دیا گیا کہ "یہ کیفیت جو دونوں مولویوں کی آئی ہے دوحرفی آئی ہے اس کا اعتبار کیا ہے کر یک طرفہ بنائی ہے، اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا، رعایا کا ستانا ہے، آپ نائب سلطان ہیں، یہاں برابر ہندو مسلمان ہیں، انصاف یہ ہے کہ راجہ مان سنگھ بہادر اعظم اور آغا علی خان بہادر ناظم کو ارشاد ہو کہ وہ جا دیکھیں اور تحقیقات کریں" [۲]

---

[۱] کتاب مذکور میں قاضی یار علی ابن الابن قاضی حبیب اللہ ہی درج ہے۔ نقل حوالہ میں اصل کی رعایت کی گئی ہے۔ [۲] امیر علی شہید اور معرکہ ہنومان گڑھی، ص ۲۳۔

نواب علی نقی خاں وزیر کی تو عین مرضی یہی تھی، کیونکہ وہ مظلوم مسلمانوں کے خون کے عوض بیراگیوں سے زرنقد لے کر انھیں ہر طرح کا اطمینان دلا چکے تھے[1] اس لئے مولوی نہال الدین کاکوردی اور مولوی حفیظ اللہ فرنگی محلی کی رپورٹ کو ردی کی ٹوکری میں ڈال کر راجہ مان سنگھ، ناظم آغا علی خان بہادر اور کپتان الگزنڈر کو دوبارہ تحقیقات کے لئے مامور کیا گیا جب کہ ان ہر سہ افراد کی بلوائیوں کے ساتھ ملی بھگت طشت از بام ہو چکی تھی، ان تینوں نے مسجد مذکور کے متعلق تحقیق و تفتیش کی بجائے یہ کیا کہ اجودھیا کے مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر صلح پر راضی کر لیا اور ساتھ ہی مہنتوں سے بھی درج ذیل اقرار نامہ لکھوالیا۔

۔ ما بآنکہ مہنت بلرام داس، دکشن داس، و مہنت دیہی رام بیراگی چارسدہ ہیں، غلام حسین وغیرہ نے دعویٰ ہونا مسجد کا ہنومان گڑھی میں کیا ہم سے نوبت بگاڑ کی پہونچی، اور مسمیان جعفر علی و محمد حسین و شیخ بدھو وغیرہ باشندے اودھ کے بوجہ شراکت غلام حسین ہم سے رنج پیدا کیا، اب بنظر رابطہ سابق ہمیں ان سے رنج و کدورت نہیں رہی اور اب آغا علی خاں بہادر، راجہ مان سنگھ بہادر قائم جنگ اور کپتان آر صاحب بہادر کو درمیان دے کر قسم مہادیو سوامی سے اقرار کرتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ بشرط عدم وقوع زیادتی اس طرف سے ہم زنہار اور اصلاً حجت و فساد و تکرار و نزاع لفظی بھی ان سے نہ کریں گے اور ہم بیراگی چارسدہ خلاف تحریر ہذا عمل نہ کریں گے اور جس طرح کہ قبل از معرکہ فیما بین ہمارے اور جعفر علی مذکور کے راہ و رسم تھی وہی ضبط اب بھی صلح و آشتی سے جاری رکھیں گے، اور کسی طرح کی بغاوت نہ کریں گے، اگر منافی اقرار اور تحریر ہذا کے کریں مجرم اور

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۹۰، و امیر علی شہید عظمت کاکوروی ص ۲۳

گنہ گار ہو کر جو سرکار سے سزا تجویز ہو اس کے سزاوار ہیں بنا براں یہ چند کلمے بطریق صلحنامہ کے لکھ دیئے گئے کہ ثانیاً حالی سند ہو اور عند الحاجت کام آوئے مرقوم ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ (دستخط ہندی بلرام داس)[1]

یہ صلحنامہ لکھنؤ پہنچا تو اسے دیکھتے ہی نواب علی نقی کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ یہ ان کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ اس کے ملاحظہ کے بعد گذشتہ تمام وعدوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے بولے کہ "جو ہونا تھا ہوا مگر اب الحمد للہ فساد مٹ گیا"۔[2]

بازیابی مسجد کی دوسری تحریک

وزیر موصوف کے اس رویّے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ طمع زر کی بنا پر بیراگیوں کی حمایت کر رہے ہیں اور تحقیق و تفتیش کے یہ احکامات محض دفع الوقتی کے لئے تھے تو مولانا سید امیر علی شہید امیٹھوی اور فرنگی محل کے بعض علماء کو اس صورت حال سے تشویش ہوئی اور انھوں نے حالات واقعات پر بالغ نظری کے ساتھ غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ سلطنت اودھ کے وزیر اور دیگر ارکان چونکہ انگریزوں اور بیراگیوں کے چشم و ابرو پر ناچ رہے ہیں ان سے کسی انصاف کی توقع بے سود ہے اس لئے خود مسلمانوں کو اس سلسلے میں جدوجہد کرنی چاہئے، چنانچہ انھیں حضرات کی تحریک پر سندیلہ میں اس سلسلہ کا پہلا اجتماع ہوا، جس میں مسجد کی بازیابی قرآن مقدس کی توہین اور خونِ شہداء کے انتقام کے لئے جدوجہد اور تحریک جاری کرنے کی تجویز باتفاق شرکائے اجتماع طے ہوئی، اور تحریک کے امیر مولانا سید امیر علی امیٹھوی منتخب ہوئے۔[3]

اس تجویز کے مطابق امیر المجاہدین ضروری اسباب و جمعیت کی فراہمی میں

---

[1] قیصر التواریخ ج ۲ ص ۱۱۹/ ۱۲۰۔ [2] امیر علی شہید اور معرکۂ ہنومان گڈھی، ص ۲۳۔

[3] تاریخ اودھ ج ۴ ص ۱۹۔

مشغول ہو گئے، علماء و عمائدین میں سے مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی، مولانا برہان الحق فرنگی محلی، ان کے صاحبزادے مولانا المعان الحق، مولانا حسام الحق نبیرہ مولانا نورالحق محمد خورشید حسن رئیس اکبرپور ضلع فیض آباد، سید محمد سرفراز کاکوردی، مولانا عبدالغفار بن مولانا عبدالجامع وغیرہ بھی آپ کے شریک کار ہو گئے، عام مسلمانوں نے بھی جذبۂ ایمانی کے ساتھ آپ کی رفاقت و معاونت کی اور دیکھتے دیکھتے مجاہدین کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی۔

مجاہدین کی اجودھیا روانگی اور سرکاری وفد کی آمد

اب امیر المجاہدین نے کوچ کا حکم دیا چنانچہ لکھنؤ سے چل کر مجاہدین نے پہلی منزل امیٹھی میں کی، خیال یہ تھا کہ یہاں چندے قیام کر کے پھر فیض آباد کا عزم کیا جائیگا، لیکن آپ کے لکھنؤ سے روانہ ہوتے ہی وزیر ریاست علی نقی کے کان کھڑے ہو گئے، اس نے دوسرے ہی دن مولوی نقی اللہ اور میر صفدر علی چکلہ دار حیدر گڑھ کو امیٹھی روانہ کر دیا کہ کسی طرح سمجھا بجھا کر مجاہدین کو آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ امیٹھی پہونچ کر میر صفدر علی نے امیر المجاہدین اور دیگر عمائدین سے گفتگو کی اور حلفیہ یہ عہد نامہ لکھ کر دیا کہ اگر ہنومان گڑھی میں مسجد کا ثبوت ہو گیا تو مسجد بلا تاخیر تعمیر کرا دی جائے گی اور بیراگیوں سے بھی انتقام لیا جائے گا، اور اگر یہ ثبوت فراہم نہ ہوا تو پھر مجبوری ہے۔ میر صفدر علی کے اس عہد و میثاق پر اعتماد کر کے مولانا عبدالرزاق مع اپنے اعوان و انصار کے امیٹھی سے لکھنؤ واپس لوٹ آئے، مگر امیر المجاہدین مراجعت کیلئے تیار نہیں ہوئے، مولانا عبدالرزاق صاحب لکھنؤ آکر وزیر ریاست کی طلب پر ان سے چند بار ملے اور مسئلے سے متعلق تفصیلی گفتگو کی، وزیر نے مولانا موصوف کو باصرار خلعت و انعام کی پیش کش کی مگر مولانا اس کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہوئے

چند بار کی دربار میں حاضری اور بات چیت سے مولانا کو یقین ہو گیا کہ میر صفدر علی کا عہد و میثاق ایک فریب تھا اس لئے انھیں اپنی واپسی پر ندامت ہوئی، اور دوبارہ امیٹھی جانے کا عزم کیا، لیکن اب شہر سے نکلنا دشوار تھا، کیونکہ تمام راستوں پر سرکاری پہرے بٹھادیئے گئے تھے۔

دوسرا سرکاری وفد اور امیر جماعت مولانا امیر علی کی لکھنو مراجعت

مولانا عبدالرزاق صاحب کی واپسی کے بعد امیر المجاہدین کے پاس دوسرا وفد بھیجا گیا، جو منشی امیر حیدر علی اور خواجہ سرا البشیر الدولہ پر مشتمل تھا، یہ وفد امیٹھی پہونچا اور امیر المجاہدین کو ہر طرح سے اطمینان دلایا کہ مسجد ثابت ہوتے ہی تعمیر کرادی جائے گی، اب انھوں نے بھی مزید اصرار مناسب نہ سمجھا۔ اور لکھنو مراجعت کیلئے تیار ہو گئے۔

وزیر نواب کے دربار میں حاضری

دو دن بعد مجاہدین کو ہمراہ لے کر عازم لکھنو ہوئے، جب شہر سے قریب پہونچے تو سرکاری طور پر آپ کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ وزیر ریاست کے دربار میں لائے گئے، وزیر نے حد درجہ ملاطفت و تواضع کا معاملہ کیا، اور کسی طرح کی گفت و شنید سے پہلے ہی خلعت اور پانچسو نقد حاضر کرنے کا حکم دیا، پھر ان الفاظ میں گفتگو کا آغاز کیا کہ خدا کی راہ اور سربلندیٔ اسلام کے لئے آپ کی اس جانسپاری کو سرکار بھی بنظر استحسان دیکھتی ہے، لہذا اس حسن عمل کے صلہ میں خلعت اور زر نقد قبول کیجئے اور چندے صبر کیجئے جیسے ہی مسجد کا ثبوت فراہم ہو جائے گا مسجد تعمیر کرادی جائے گی اور مہنتوں کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ امیر المجاہدین نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ ہم دین کے خدام نہ چکلہ دار ہیں نہ سپہ سالار، ہمیں اس خلعت و انعام سے کیا سروکار، ہماری گذارش

توبس اتنی ہے کہ ہمیں جہاد کی اجازت دی جائے تاکہ بیراگیوں سے مسلمانوں کے خون ناحق اور قرآن عزیز کی بے حرمتی کا انتقام لیں، اس پر ایک درباری مولوی یوں گویا ہوا کہ آپ کا یہ عمل جہاد شرعی نہیں ہے، کیونکہ اس میں شرط امامت مفقود ہے لہٰذا یہ جہاد کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا، امیر المجاہدین نے اس پر فرمایا کہ بدقسمتی سے اس وقت ہمارا کوئی امیر نہیں ہے، کیونکہ موجودہ امراء میں امارت کی شرط نہیں پائی جاتی، ایسی حالت میں مسلمان باہمی اتفاق سے کسی کو امیر الجہاد منتخب کریں، تو اس کی سرکردگی میں جہاد شروع ہو جائیگا، یہ جواب باصواب سن کر مولوی صاحب موصوف اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، امیر المجاہدین کے اس کہنے پر کہ اس وقت ہمارا کوئی امیر نہیں ہے وزیر علی نقی کا چہرہ فق ہو گیا، اور اب آگے گفتگو مناسب نہیں سمجھی، اس لئے بمصلحت خوشامدانہ باتیں کر کے چند دن کے بعد پھر گفتگو کریں گے کا بہانہ کر کے امیر المجاہدین کو دربار سے واپسی کا حکم دیا آپ وہاں سے واپس آکر اپنے رفقار کے ساتھ مقبرہ امجد علی شاہ کی مسجد میں فروکش ہو گئے۔

لکھنؤ سے واپسی کی خواہش جواب میں فرمان شاہی

اس گفتگو کے بعد وزیر نواب بہادر کے منشار کے مطابق امیر المجاہدین کئی ہفتے لکھنؤ میں مقیم رہے اس مدت میں بشیر الدولہ خواجہ سرا ضیافت کی خدمت انجام دیتے رہے اور کبھی کبھی جائے قیام پر آکر ملاقات بھی کر جاتے تھے لیکن وزیر علی نقی صاحب امیر المجاہدین کو رخصت کرنے کے بعد اس طرح خاموش ہو گئے، گویا انھیں یاد ہی نہیں رہا کہ کسی کو ٹھہرنے اور دوبارہ گفتگو کرنے کے لئے کہا ہے، ایک طرف ان کی یہ سرد مہری اور پُراسرار خاموشی تھی دوسری جانب مجاہدین پر شوق جہاد میں انتظار کا ایک

ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔ اس صورتِ حال سے مجبور ہو کر امیر المجاہدین نے رخصت چاہی تو اس کے جواب میں دیوانِ عام سلطانی سے ان کے نام درج ذیل فرمان جاری ہوا۔

"از آنجا کہ قریب دہ ہزار مردم اہل اسلام بارادۂ منازعت با ہنودان ہنومان گڑھی واقع اودھ ہمراہئ ایشاں عزیمت می داشتند و بندگان سرکار فلک اقتدار بدون مشارکت و مداخلت فریقین رفع شر و فساد بعد تحقیقات واقعی منظور معدلت منظر است، لہذا حسب الحکم جہاں مطاع بایشاں نگارش می رود کہ نظر بر توقع تدارک مراتبِ مرقومہ بعد تحقیق تہیۂ خود موقوف داشتہ زنہار پیرامون اجماع و ارتکاب شر و فساد نروند و ہرگونہ از سرکار مترصد تدارک مناسب باشند تاکید دانند۔ دوازدہم ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ"[۱]

اس فرمان کے ذریعہ امیر المجاہدین کو ہدایت کی گئی تھی کہ آپ کے ہمراہ تقریباً دس ہزار مسلمان ہنومان گڑھی اجودھیا کے ہندوؤں سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں، جب کہ سلطانی اہل کار ضروری تحقیقات کے بعد بغیر فریقین کی مداخلت کے معاملہ کا تصفیہ کرنا چاہتے ہیں، لہذا آپ کو مطاع جہاں یعنی سلطان نواب واجد علی کا حکم ہے کہ آپ اپنے ارادہ کو ترک کر دیں اور شر و فساد سے اپنے کو دور رکھیں، اور سرکار کی جانب سے معاملہ کے تصفیہ کے امیدوار رہیں، اس حکم کو تاکیدی سمجھیں۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ۔

لکھنؤ سے روانگی اس فرمان نے رہی سہی امیدیں بھی ختم کر دیں اور مجاہدین کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ مولوی

---

[۱] حدیقۂ شہدا، ص ۲۸۔

نہال الدین کاکوروی اور مولوی حفیظ اللہ فرنگی محلی داروغہ عدالت فیض آباد کی تحقیقات کے بعد بھی یہ لوگ ثبوتِ مسجد کی طرف سے عدمِ اطمینان کا اظہار کر کے اس انتہائی اہم اور جذباتی مسئلہ کو معرض التوا میں ڈالنا چاہتے ہیں، گفت وشنید اور وعدہ وعید محض دفع الوقتی کے لئے ہے، اس لئے ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو جمعہ کی نماز ادا کر کے لکھنو سے رخت سفر باندھا، ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ راستے میں مولوی مسیح الزماں کانپوری جو شیریں بیان خطیب کے علاوہ صاحب حیثیت تاجر تھے حاضر خدمت ہو کر امیرالمجاہدین کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی، لشکر میں ان کی شمولیت سے مجاہدین کو بڑی مسرت ہوئی، بعد میں یہ جماعت مجاہدین کے تحویلدار مقرر ہو گئے تھے۔ شام کے وقت مجاہدین کا یہ قافلہ امیٹھی پہنچ گیا، یہاں ایک شب قیام کر کے دوسرے دن فیض آباد کے لئے روانہ ہو گیا، تیسرے دن جانفروشوں کا یہ کارواں قصبہ رسولی میں وارد ہوا، یہیں مولانا برہان الحق فرنگی محلی لشکر میں شامل ہوئے، انھیں اندیشہ تھا کہ امیرالمجاہدین کے ہمراہ جانے پر سرکاری حکام قدغن لگادینگے اس لئے لکھنؤ سے مجاہدین کے کوچ کرنے سے ایک دن قبل ہی یہ تنہا روانہ ہو گئے تھے اور رسولی میں مجاہدین کے انتظار میں مقیم تھے، رسولی سے چل کر قصبہ بانسہ میں شیخ عبدالرزاق بانسوی کے مقبرہ میں تیسری منزل ہوئی، یہاں قرب وجوار کے بہت سارے مسلمان آکر شریک لشکر ہوئے۔

سرکاری وفد کی آمد

مجاہدین بانسہ ہی میں تھے کہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو ایک سرکاری وفد جو میر صفدر علی، رمضان علی، مان سنگھ، محمد تہور خاں رسالدار، میر محمد حسین کلکٹر اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد پر مشتمل تھا یہاں پہونچ گیا، جس کی غرض یہ تھی کہ کسی حیلہ وتدبیر سے مجاہدین کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے، چنانچہ وفد نے امیرالمجاہدین

کی خدمت میں حاضر ہو کے گفتگو شروع کی اور باتفاق قرآن کا واسطہ دلا کر یہ کہا کہ آپ ایک ماہ توقف فرمائیں اور اس مدت میں سہالی یا فتح پور میں سے جس مقام کو پسند کریں قیام فرمائیں اس زمانے کے لشکر کے مصارف سرکار ادا کرتی رہے گی تہور خاں رسالدار نے سپاہیانہ جوش میں یہاں تک کہا کہ بالفرض اس میعاد میں مسجد تعمیر نہ ہوئی تو ہم بھی آپ کے شریک کار ہو جائیں گے، امیر المجاہدین نے ان کے اس پختہ عہد پر اعتماد کر کے یہ سوچا کہ مقصود تو مسجد کی بازیابی ہے، اگر یہ تعمیر ہو کر مسلمانوں کے حوالہ ہو جاتی ہے تو جنگ و جدال کی ضرورت ہی کیا ہے، اس لئے سرکاری وفد کی تجویز کے مطابق سہالی میں آکر مقیم ہو گئے، البتہ جماعت مجاہدین کے تحویلدار مولوی مسیح الزماں کانپوری نواب وزیر سے مزید گفتگو کے لئے تہور خاں رسالدار کے ہمراہ لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے، وہاں پہونچ کر تہور خاں کی وساطت سے، چند بار وزیر سے ملاقاتیں بھی کیں مگر سب بے نتیجہ رہیں، سہالی کے زمانہ قیام میں مولانا تراب علی کاکوروی، اور مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کسی طرح بچ بچا کر امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ان علمائے ذی شان کے آنے سے لشکرِ اسلام کی رونق دوبالا ہو گئی، اور مسلمان جوق در جوق آ آکر مجاہدین کی صف میں شامل ہونے لگے۔

مولوی مسیح الزماں کا انحراف

لکھنؤ میں کچھ دن قیام کے بعد مولوی مسیح الزماں کانپوری بھی سہالی آ گئے مگر اب رنگِ طبیعت کچھ اور ہی تھا، پہلے تو جذبۂ جہاد سے سرشار، مجاہدین کی ہر خدمت کیلئے تیار، مگر لکھنؤ سے واپسی کے بعد ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی، تہور خاں اور نواب وزیر نے نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ جہاد کا شوق باقی نہ رہا نہ مجاہدین کی خدمت کا جذبہ بلکہ اس کے برعکس زر اندوزی کی فکر اور در پردہ مجاہدین میں تفریق و نفاق پیدا کرنے کی کوشش ان کا مشغلہ ہو گیا، چونکہ پہلے سے امیر المجاہدین کے معتمد اور لشکر کے تحویلدار تھے

اس لئے ابتدا میں اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے لیکن جب آہستہ آہستہ حقیقتِ حال کھل گئی تو بالآخر جماعت سے خارج کر دیئے گئے۔

حکومت کی عہد شکنی اور مجاہدین کا عزم سفر

۲۱ر ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ[1] کو سرکاری وفد نے ایک ماہ کی مہلت طلب کی تھی اور پختہ عہد کیا تھا کہ اسی دوران مسجد تعمیر ہو جائے گی، مگر اس بار بھی حسب سابق سارے عہد و پیمان کو پس پشت ڈال کر سرد مہری اور تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا گیا، میعاد مقررہ کے پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا کہ امیر المجاہدین نے مولانا تراب علی کاکوروی اور مولانا برہان الحق فرنگی محلی وغیرہ سے فرمایا کہ بتایئے اہالیانِ سرکار کو اب کیا عذر رہا، یہ لوگ تو محض وقت گذاری کے لیے اس طرح کی حیلہ جوئی کرتے ہیں مسجد کی واگذاری انھیں قطعاً منظور نہیں ہے، اس لئے اب مزید کسی تاخیر کے ہمیں سرگرم عمل ہو جانا چاہیئے، ان حضرات نے بھی تائید کی، چنانچہ روانگی کی تاریخ کا اعلان ہو گیا اور مجاہدین پوری تندہی اور جذب و شوق کے ساتھ سفر کی تیاریوں میں لگ گئے

مجاہدین کو روکنے کی پھر کوشش

نواب وزیر علی نقی خان اور دیگر کارکنان حکومت کی اصل خواہش یہی تھی کہ کسی طرح مجاہدین کی جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے، اور یہ تحریک منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی راستے میں دم توڑ دے، بار بار کی مہلت طلبی اور مہلت ملجانے پر سرد مہری درحقیقت اسی منفی خواہش کی تکمیل کے لئے اختیار کی جاتی تھی کہ اس طرح روز روز کے التوا سے مجاہدین بد دل ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں در پردہ ترغیب و ترہیب اور خوف و لالچ کے ذریعہ بھی جماعت کے اہم افراد کو منحرف و برگشتہ کرنے کی سازش شروع کر دی گئی تھی، جس کا شکار مجاہدین کے تحویلدار مولوی مسیح الزماں ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھیں منفی مقاصد کے تحت

---

[1] مولوی نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں ۲۴ر ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ تاریخ لکھی ہے۔

محمد تہور خاں رسالدار، مرزا قدرت اللہ بیگ چکلہ دار، میر محمد حسین کلکٹر اور حسین علی کارندہ نواب محمود آباد کو پھر امیر المجاہدین کی خدمت میں روانہ کیا گیا، ان لوگوں نے حاضر ہو کر خوشامدانہ طور پر عرض کیا کہ آنجناب کی خدمت میں آتے ہوئے شرم آتی ہے پر کیا کریں ملازمت کی مجبوری سب کچھ کراتی ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہم کسی طرح بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، اب پھر نواب بہادر نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ یہ مہینہ فرزند رسولؐ کے ماتم کا تھا، ہم عزاداریٔ محرم میں مشغول رہے اس لئے مسجد کی تعمیر کا موقع نہ مل سکا، ہماری اس مجبوری کے پیش نظر کچھ توقف اور فرمائیں انشاء اللہ خانۂ خدا جلد تیار ہو جائیگا، اس کام کے لئے مان سنگھ کو اجودھیا بھیج دیا گیا ہے اگر اس نے مسجد بنوادی تو بہتر ورنہ مع اسکے مہنتوں کے دربار میں طلب کیا جائے گا، اب مسجد کی تعمیر میں کسی طرح کا تغافل نہ ہوگا، اور مناسب یہ ہے کہ آنجناب مولانا برہان الحق فرنگی محلی، مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی، اور مولانا تراب علی کاکوروی پر مشتمل ایک وفد بھیج دیں تاکہ دو بدو گفتگو ہو کر سارے معاملات طے ہو جائیں، اور ان حضرات کی واپسی تک آپ اپنے مستقر پر قیام پذیر رہیں، امیر المجاہدین نے مزید اتمام حجت اور رفع عذر کیلئے ان کی بات مان لی، اور تینوں حضرات علماء کو پانچ یوم کے وعدہ پر لکھنؤ روانہ کر دیا، اور انھیں کے ذریعہ نواب واجد علی شاہ کی خدمت میں ایک منظوم عرضداشت بھی روانہ کی، بغرض اختصار اس منظوم کے اہم اور ضروری اشعار یہاں نقل کئے جا رہے ہیں

منظوم عرضداشت از مولانا امیر علی شہید بخدمت نواب واجد علی شاہ

سپاس و حمد بدرگاہ خالق کونین	سلام حضرت باری بہ سید الثقلین
درود حضرت حق بر رسول عالی جاہ	بر آل اطہر و اصحاب آں رسول اللہ

اب اس زمانے میں افسوس وآہ واویلا — ہوا ہے از سرِ نو اہلِ دیں کو رنج وبلا
کہ کافران اودھ نے زراہ ظلم وعناد — کیا ہے لشکر اسلام سے کمال عناد
قریب دیر جہا بیر واجب التعزیر — بنا تھی مسجد اسلام ہم چو بدر منیر
بعہد درسنِ ملعون وکافر وگمراہ — کیا فساد یہ بیراگیوں نے خاطر خواہ
لگے بنانے بڑھا کر یہ کافر مقہور — سواد مسجد اقدس میں خانۂ لنگور
حصار دیر میں محصور کر لیا مسجد — شمول معبدِ مقہور کر لیا مسجد
خبر یہ سن کے اٹھے اہل دیں بہ شیون وشین — گئے قلیل جماعت سے واں غلام حسین
بجنگ کافر ظلم مجاہدین سعید — خدا کی راہ میں غازی ہوئے تمام شہید
پس از شہادت آں کشتگانِ راہِ خدا — چہار طرف سے آ کر کے لشکرِ اعداء
بنائے مسجد عالی کو کر دیا مسمار — زراہِ بغض وعداوت لعینِ ناہنجار
جلایا آگ میں قرآن ایزد باری — ہر ایک لاش کو دی خوب ذلت وخواری
اودھ کا ناظم گمراہ تھا جو آغائی — بچشم دیکھ گیا مومنوں کی رسوائی
جو کوتوال ہے اس شہر کا وہ منعم بیگ — لیا مہنتوں سے اس نے بخوبی اپنا نیگ
شریک قتل رہا وہ بھی اور نثار حسین — نصیب باد سواد الوجوہ فی الدارین
امید ہے کہ شہنشاہ قبلۂ عالم — ابوالمظفر ومنصور وخسرِ اعظم
زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد — کہ کافران اودھ پر شتاب ہوئے جہاد
بعہد میمنتِ عہد حضرت سلطان — جناب واجد علی شاہ سایۂ رحماں
لوائے نصرتِ اسلام ہو گیا استاد — بسمت شہرِ اودھ از برائے عزم جہاد
غریب وبیکس ومسکیں وبادلِ غمگیں — محب آل نبی عبدہ امیر الدیں
اٹھا ہے خادم شرعِ رسول والا جاہ — بپاس اشہد ان لا الہ الا اللہ
دریں ولا کہ شہالی میں کر دیا ہے مقام — بحکمِ حضرتِ سلطانِ دین ذوالاکرام

بپاس دین رسالت پناہ صل علی — کہ فرض عین ہے مقہور کردن اعدار

روانہ ہوئے گا شبنے کو لشکرِ اسلام

اللھم انصر من نصر دین محمدؐ ولخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم[1]

۲۷ رمحرم ۱۲۷۲ھ کو علمائے کرام کا یہ وفد لکھنؤ پہونچ گیا، بالمشافہ اور روبرو گفت گو کے لئے اجودھیا سے مہنتوں کو بھی طلب کیا گیا، اور فریقین کے درمیان ثالثی کی خدمت انجام دینے کیلئے احمد علی خان، مولانا غلام جیلانی، مولانا غلام امام شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی منتخب ہوئے، یہ حضرات بھی وزیر صاحب کی طلب پر لکھنؤ پہونچ گئے، ان سارے انتظامات کے باوجود خدا جانے نواب وزیر کے پیشِ نظر کیا مصلحت تھی کہ یہ وفد پانچ یوم کے بجائے ہفتہ عشرہ لکھنؤ میں ٹھہرا رہا لیکن اس سے کسی قسم کی کوئی گفت وشنید نہیں ہوئی، در حقیقت یہ بھی وقت گذاری کی ایک چال تھی ساتھ ہی اس بہانے ان مقتدر اور با اثر علمار کو مجاہدین کی جماعت سے الگ تھلگ کر دینا مقصود تھا جس میں وزیر باتدبیر کامیاب بھی ہوگئے، کہ ان تینوں حضرات کو لکھنؤ میں اس طرح محصور کر لیا گیا کہ پھر انھیں لشکرِ اسلام میں واپسی کا موقع ہاتھ نہ آیا، ہمیں لکھنؤ سے نامہ وپیام کرتے رہے۔

قصبہ سہالی سے روانگی

اس سفارت کی ناکامی کے بعد اب سہالی میں قیام کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا اس لئے ۸ صفر ۱۲۷۲ھ کو نقارۂ کوچ بجا اور پورے تزک واحتشام کے ساتھ مجاہدین کا لشکر سہالی سے روانہ ہوا، اور موضع بالی ہوتے ہوئے بانسہ پہنچا، یہاں دو روز قیام کرکے ۹ رصفر کو روانہ ہو کر دریا آباد کی عیدگاہ کے باغ میں خیمہ زن ہوا۔ دریا آباد ہی میں مجاہدین کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے اور بوقت ضرورت کارروائی کرنے کی غرض سے

[1] حدیقۃ الشہداء، ص ۳۵-۳۶۔

وزیر بہادر کے حکم سے سرکاری فوج بھی پہونچ گئی۔

دریا آباد کا تحصیلدار ذاکر حسین امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی تعلق آمیز باتیں کیں اور امیر المجاہدین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دیئے، پھر یہاں سے اٹھ کر شاہی فوج میں پہنچا اور وہاں یہ بات اڑا دی کر کہ مجاہدین لشکر شاہی پر حملہ کی تیاریوں میں ہیں، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شاہی لشکر میں پھیل گئی اور ساری فوج مسلح ہو کر مقابلے کے لئے مجاہدین کے سامنے صف آرا ہو گئی، مجاہدین نے سرکاری لشکر کو جب آمادۂ جنگ دیکھا، تو انھوں نے بھی امیر المجاہدین سے مدافعت کی اجازت طلب کی، امیر المجاہدین نے فرمایا، تم لوگ خاطر جمع ہو کر اپنے بستر لگا کر آرام کرو یہ لوگ کسی غلط فہمی کی بنا پر صف آرا ہو گئے ہیں، ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ شیخ حسین علی شاہی فوج کے رسالدار پہنچ گئے، اور اپنے لشکر کو لعنت ملامت کر کے واپس لے گئے۔

مجاہدین کے خلاف ایک نئی چال

مجاہدین کا لشکر جیسے جیسے فیض آباد سے قریب ہو رہا تھا، ان کی تعداد روز افزوں بڑھ رہی تھی، اس کیفیت سے نواب بہادر وزیر علی نقی خان بڑے متوحش اور فکر مند تھے اور مجاہدین کے اندر انتشار اور بد دلی پیدا کرنے کی تدبیر سوچنے میں لگے تھے بالآخر بڑے غور و فکر کے بعد یہ نسخۂ کیمیا ان کے سمجھ میں آیا کہ علماء کا ایک وفد بھیج کر مجاہدین کی موجودگی میں مسئلہ جہاد کے خلاف امیر المجاہدین سے گفتگو کرائی جائے، نیز اسی کے ساتھ اس تحریک کے خلاف فتویٰ لے کر بھی شائع کیا جائے، چنانچہ اس تجویز کے مطابق پہلے اپنے ہم مذہب دو شیعی مولویوں سلطان العلماء میر سید محمد مجتہد اور سید العلماء میرن صاحب مجتہد کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ آپ دونوں حضرات مجاہدین کی جماعت میں جا کر انھیں بتائیں کہ یہ

جہاد نہیں بلکہ فساد فی الارض اور بغاوت ہے اس میں جو قتل ہو گا وہ جنت سے محروم رہے گا، زمانہ شناس ان دونوں مجتہدوں نے بیک زبان کہا کہ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ ہنود بت پرست ہیں لیکن ذمی اور اسلام کے مطیع ہیں ان پر خروج بالکل روا نہیں ہے، علاوہ ازیں مذہب امامیہ کی رو سے بغیر امام کے جہاد درست نہیں ہے اس کے برعکس فرقہ اہل سنت والجماعت جو اہل بیتِ رسول کے دشمن ہیں ان کا قتل سرمایۂ ثواب عظیم اور جہاد اکبر ہے۔ پھر بھی ہمارا مجاہدین کے پاس اس کام کیلئے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، عام مسلمان اسے مذہبی چپقلش پر محمول کریں گے اور فائدہ کے بجائے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس خدمت کے لئے خود اہل سنت والجماعت کے علمار مقرر کئے جائیں

وزیر صاحب کو ان کی یہ رائے پسند آئی اور اس کام کے لئے سنّی علمار میں سے مفتی سعد اللہ مراد آبادی، رامپوری، مفتی محمد یوسف فرنگی محلی، مولانا حسین احمد (غالباً محدث ملیح آبادی ہیں) مولانا ابوالحسن فرنگی محلی کو منتخب کیا گیا، مفتی سعداللہ مراد آبادی اور مفتی محمد یوسف فرنگی محلی تو پہلے ہی سے سرکاری ملازم تھے اور آخرالذکر دونوں علمار کا اگرچہ سرکار اودھ سے اس قسم کا تعلق نہیں تھا پھر بھی کسی طرح انھیں اس کام کے لئے تیار کر لیا گیا، یہ چاروں حضرات لشکر اسلام میں پہونچے مفتی سعداللہ مراد آبادی نے گفتگو شروع کی پہلے تو امیر المجاہدین کے شوقِ جہاد اور جذبۂ شوکتِ اسلام کی تعریف کی، پھر مطلب کی طرف رجوع ہوئے اور کہا کہ جناب من جہاں تک معاملہ ہنود سے مقابلہ اور کفار سے انتقام کا ہے اس کی بصورت موجودہ گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اب تو براہ راست فوج سلطانی اور حکومتِ وقت سے نبرد آزمائی کی شکل پیدا ہو گئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ سرکاری فوج مجاہدین کی تعداد اور اسلحہ

لہ حدیقۂ شہدار، ص ۱۰۴۔

ہر اعتبار سے زائد ہے اس صورت میں جہاد کے ارادے سے باز آجانا فرض اور ضروری ہے کیونکہ حکومت وقت سے مقابلہ اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور قرآن میں صراحت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ لہٰذا بحالت موجودہ جنگ میں ثواب کے بجائے عذاب کا اندیشہ ہے، اگر آنجناب کا خیال یہ ہے کہ ہم سرکاری نوکر ہیں، اپنی ملازمت کے پاس و لحاظ میں یہ کہہ رہے ہیں تو مولانا ابوالحسن صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب سے دریافت کرلیں، یہ حضرات تو سرکاری نوکری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، ان دونوں حضرات نے بھی مفتی سعد اللہ صاحب کی تائید میں سر ہلادیا، امیر المجاہدین نے موقع کے لحاظ سے ان حضرات کو جواب دیا، جس کے بعد یہ مجلس برخواست ہوگئی اور یہ حضرات اپنی خدمات انجام دے کر لکھنؤ واپس چلے گئے، وزیر با تدبیر کی توقع کے مطابق یہ تدبیر بہت کارگر ہوئی، ان حضرات کے اس بیان سے مجاہدین کی جماعت میں باہم سرگوشیاں شروع ہوگئیں اور بہت سے لوگ یہ کہہ کر اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے کہ جب یہ جہاد شرعی نہیں ہے اور اس راہ میں جان دینے سے بجائے ثواب کے عقاب کا اندیشہ ہے تو بے فائدہ اپنی جان گنوانا معقول بات نہیں ہے۔

تحریک کے خلاف فتویٰ

اس زبانی گفتگو کے علاوہ مذکورہ حضرات علماء سے تحریری فتویٰ لے کر بھی شائع کیا گیا، ذیل میں استفتاء اور فتویٰ دونوں کی عبارتیں درج کی جارہی ہیں۔

(استفتاء)

؛ چہ می فرمایند علمائے دین و مفتیان شرعِ متین کہ مولوی امیر الدین علی بانتقام بے ادبی با کلام مجید و انہدام مسجد و کشتہ شدن شہیدان اودھ از دستِ کفارانِ اودھ بموجب احکام علماء و احادیث نبویؐ و احکام

کلام مجید کمر ہمت برائے جہاد بستہ راہی ہنومان گڑھی می شوند، در مقام دریاباد افواج شاہی سد راہ شد ممانعت کوچ می سازند و مولوی صاحب مذکور بہ جوش حمیت دین وعدۂ جاں نثاری از حضرت باری نمودہ فسخ عزیمت نمی سازند و بادشاہ باعث فساد حاکم بالا مجبور شدہ براہ مصلحت چند ایام منع روانگی می فرمایند دریں حال اگر مولوی امیر الدین علی صاحب کوچ سازند و مقاتلہ و مجادلہ از مجاہدان و افواج سلطانِ اسلام بوقوع آمد پس مرگ مسلماناں طرفین چگونہ خواہد بود حسبۃً للہ بلا رو رعایت دستخط مزین فرمایند۔

سوال کا حاصل یہ ہے کہ مولوی امیر الدین علی صاحب حمیت اسلام میں جہاد پر کمر بستہ ہیں، اور فوج سلطانی انھیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہے اور مصلحتاً انھیں چند دن کے لئے توقف کا حکم دے رہی ہے مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آرہے ہیں اس صورت میں اگر مجاہدین اور لشکر سلطانی سے مقابلہ ہوجاتا ہے تو دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون ہوگا، لہٰذا صورتِ حال کا جو حکمِ شرعی ہو بغیر کسی رو رعایت کے بیان کرکے اپنے دستخط فرمادیں۔

○ جوابات من جانب حضرات علماء :-

(۱) ہو الموفق دریں حال جماعت مولوی امیر الدین علی را ہرگز قتال روا نیست بل در نہی قولہ لا تلقوا بایدیکم الی التہلکہ داخل شدن است، کذا فی العالمگیریہ و ہر کہ مرتکب منہی عنہ باشد اصلاً ثواب نخواہد شد۔

واللہ اعلم بالصواب

محمد سعد اللہ عفی عنہ

(۲) فی الواقع فسخ عزیمت می باید و در شہادت دغدغہ است - واللہ اعلم

کتبہ محمد یوسف

(۳) صح الجواب ۔ حررہ حسین احمد غفرلہ اللہ ذنوبہ ۔

(۴) صح الجواب ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ کتبہ بخط عبیداللہ عفی عنہ

(۵) ہوالمصوب والمعین ۔ اگر از حاکم بالادست انتزاع سلطنت واجرائے کلمۃ النصاری بظن قوی متصور ومتیقن باشد بحکم آنکہ من ابتلی ببلیتین فالازم علیہ ان یختار اہونہما وماکان تحت الامر ماجور ومثاب واللہ اعلم بالصواب وعلیہ التکلان ۔ حررہ افقر العباد ابوالحسن عفاعنہ[1]

ان جوابات کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ صورت میں یہ جہاد شرعی نہیں ہے، لہذا مولوی صاحب کو اپنے ارادہ سے باز آجانا چاہیے، یہ فتویٰ جب مجاہدین کے پاس پہنچا تو انھوں نے مزید اطمینان کے لئے ایک استفتاء تیار کرکے علماء سے اس کا جواب طلب کیا، مجاہدین کے استفتاء کی عبارت یہ ہے۔

استفتاء از مجاہدین

• چہ فرمایند علمائے دین اندریں صورت کہ جائے معبد معتبر کفارست ومؤمناں می گویند کہ دریں جا مسجدے بود، کفار احاطہ معبد خود را متوسع کردہ مسجد را درون احاطہ درآوردہ کندہ اند ومثبت مسجد آنجا بعض عبارات کتب تواریخ وہم محاضرہ مختومہ مؤمنین ونیز اتفاق اکثر مرداں بر بودن مسجد وبعضے مدعی گذاردن نماز درآں مسجد ہم موجود پس بسبب ایں چنیں امور چند مؤمنان بعزم اخراج جائے آں مسجد وبنائے آں مستعد شدہ وکفاراں مسجد را انکار نمودہ درون مسجد دیگر مومنان را بہ قتل رسانیدہ با قرآن مجید بے ادبیہا کردند ودر مسجد مقتول فیہ رسوم خود جاری نمودہ، دریں صورت مسجد منہدم ثابت می شود یانہ وجہاد با کفار فرض می شود یانہ واز منع حاکم باز آمدن

---

[1] حدیقۂ شہداء، ص ۴۴ ۔

از جہاد واجب است یا نہ وچوں حاکم فوج خود بر مجاہداں مسلط کند و در
قتال خوف مقتولیت باشد و در باز آمدن خوف گرفتاری پس چہ باید،
بینوا توجروا۔ فقط۔

:- جواب استفتاء :-

ہوالمصوب :- درصورت مسئولہ بودن مسجد مسطور منہدم ثابت واستشہاد
بطریق محاکمہ ضرورت ندارد چہ امور دین خبر واحد کافیست ودریں جاخبر
اشخاص متعدد کہ اطلاق برآں جماعت یافتہ می شود وآں در معاملات ہم
حجت است کما فی مختارات النوازل خبر واحد حجۃ فی امور
الدین ویجب العمل بہ وفیہ بعد سطور متعددۃ اخبر قوم انہ
حلال ان کانوا عدو لا یقبل قولھم لان خبر الجماعۃ حجۃ فی
الاحکام وآں بلدہ دار الحرب گشتہ چہ دار الاسلام بسبب اجرائے
احکام کفر دار الحرب می شود کما فی فتاویٰ السراجیۃ "دار الاسلام لا تصیر
دار الحرب الا بشرائط ثلثۃ منہا ان یکون متصلہ بدار الحرب
ومنہا ان یظہر فیہا احکام الکفر ومنہا لا یبقی مسلم ولا ذمی امنا
بالامان الاول" وجہاد بایہاں فرض عین بر ہر کہ شنید، پس اگر باوجود
علم وصحت اعضا خبر جہاد شنیدہ وزاد وراحلہ یافتہ شریک مجاہدان
نشد آثم وتارک فرض خواہد گردید کما فی معدن الحقائق شرح کنز الدقائق
"وفرض عین ان ھجم ای اتی العدو سواء کان کافرا او باغیا
کذا فی الشرح،" وفی الدرر شرح الغرر، "وفرض عین علی من قرب
عنہو یقدرون علی الجہاد"

اس کی تائید میں نہایہ کتاب الاصلاح والایضاح، الذخیرۃ، فتاوی النافع، الجوہرۃ النیرہ

العینی شرح الکنز، الہدایہ، کمال الدرایہ شرح النقایہ ۔ درمختار، جامع الرموز وغیرہ کی عبارتیں تقریبًا ایک صفحہ میں نقل کی گئی ہیں، بخوف طوالت انھیں چھوڑ دیا گیا ہے، پھر الھجوم کے معنی کی تشریح کیلئے المغرب کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے۔

الھجوم الاتیان بغتۃ والدخول من غیر استیذان فیخرج العبد والمرأۃ بلا اذن لان المقصود لا یحصل الا باقامۃ الکل فیفرض علی الکل اھ۔

پس حاصل آں ست کہ درصورت مسئولہ جہاد فرض عین است وآں عبارت از تقویت دین ست پس اگر توہین دین بقبول منع حاکم دفع شود بایں طور کہ حاکم خود بتدارک کفرہ فجرہ پردازد وبنائے مسجد نماید وعوض خونِ مومنین کند وسزائے بے ادبی قرآن بخوبی بہ کفرہ رساند فبہا واگر بجانب داری کفار منع کند پس از منعش باز آمدن روا نیست چہ اطاعت حاکم خلاف امور شرع واجب نیست بلکہ حرام است لیکن دیدہ باید کہ از مقتولیت یا محصوریت کدام امر مفید شوکتِ اسلام ست ہماں امر جہاد ست ورجائے شوکتِ اسلام شرط اباحت جہاد است کما فی الطحطاوی حاشیہ درمختار۔ والثانی ان یرجوا الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام باجتہادہ او اجتہاد من یعتقد فی جھدہ ورائہ وان کان لا یرجوا القوۃ والشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ۔ ورجائے شوکت برعدو نیست بلکہ برقوی امید است کما فی جامع الفتاویٰ۔ ولاباس لاجل الواحد ان یحمل علی الف من المشرکین ان طمع السلامۃ او النکایۃ بھم وان کان لا یطمع احدھما کرہ لان فیہ ھلاکا من غیر فائدۃ وفی السراج وشرط الوجوب القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب اُسر لم یلزمہ القتال۔

داز سقوط وجوب قتال مظلومیت مقتولان مؤمنین کہ برائے اعلاء دین مقاتلہ کردہ بر قتل رسیدہ اند زائل نمی شود وہمیں قدر کافیست در حصول شہادت ونیز از سقوط وجوب استحباب واولویت ساقط نمی شود چنانچہ در صوم عاشورا وصیام بیض باوجود نسخ وجوب سنیت واستحباب باقیست بالاتفاق بلاخلاف پس درصورت مساوات قتل واسرہم اولویت واستحباب قتال باقی خواہد ماند وبجمل فعل مستحب رفتنِ جان کے مانعِ شہادت خواہد شد؛

واللہ اعلم بالصواب ۔ کتبہ محمد عبدالرزاق عفا اللہ عنہ [1]

استفتاء اور اسکے جواب کا حاصل

مجاہدین کی جانب سے اس استفتاء میں چار امور کا حکم شرعی معلوم کیا گیا تھا (۱) مسلمانوں کے دعویٰ کے مطابق مسجد منہدم کا شرعی طور پر ثبوت ہوتا ہے یا نہیں (۲) مسجد کی واگذاری اور قتل مؤمنین کے انتقام میں جہاد فرض ہے یا نہیں (۳) حاکم وقت کی ممانعت سے جہاد سے دست کش ہو جانا واجب ہے یا نہیں (۴) مجاہدین پر حاکم وقت کے فوج مسلط کر دینے کی وجہ سے جنگ کی صورت میں مجاہدین کا قتل اور جنگ سے رک جانے کی صورت میں قید ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے اس حالت میں شرعاً کیا کرنا چاہئے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ (۱) مؤمنین کے دعویٰ کے بموجب مسجد منہدم کا ازروئے شرع ثبوت ہو رہا ہے (۲) چونکہ اس شہر پر کفار کا پورا عمل دخل ہو گیا ہے اس لئے یہ اب دارالحرب کے حکم میں ہے لہذا ان سے جہاد فرض ہے (۳) اگر حاکم وقت کفار کی جانب داری کی وجہ سے جہاد سے منع کر رہا ہے اس حکم میں اس کی اطاعت جائز نہیں ہے (۴) البتہ یہ غور کر لینا چاہئے کہ مجاہدین کے قتل ہونے یا قید ہو جانے میں کس امر میں

[1] حدیقۂ شہداء، ص ۵۴ تا ۸۴۔

اسلام کی شوکت اور کفر کی نکبت کی قوی امید ہے، ان دونوں کاموں سے جس سے یہ امید وابستہ ہو وہی جہاد ہوگا، پھر شوکتِ اسلام کی امید کا تعلق مجاہدین اور اسلحہ کی کثرت سے نہیں ہے بلکہ مجاہدین کے جذبہ وحوصلہ سے ہے (۵) جس صورت میں مجاہدین کے قتل یا قید ہوجانے کا ظن غالب ہو اس صورت میں جہاد کی فرضیت ساقط ہوجاتی ہے لیکن فرضیت کے سقوط کے باوجود مقتولین مؤمنین کی مظلومیت کی بناء پر جہاد کا استحباب اور افضلیت باقی رہے گی (۶) اور کسی جہادِ مستحب میں جان جانے سے قطعی طور پر شہادت کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔

دریاباد سے کوچ کا اعلان

مجاہدین کے اندر انتشار و تفریق پیدا کرنے کی غرض سے یہ آخری تدبیر بھی کرلی گئی جو بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور حسب بیان مولوی نجم الغنی رام پوری جہاد کے خلاف فتویٰ کا یہ اثر ہوا کہ مجاہدین کی جماعت میں صرف چند سو افراد باقی رہ گئے ورنہ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

بایں ہمہ جہاد کا غلغلہ جو تقریباً دو ڈھائی ماہ سے بلند تھا اسے ان وقتی تدبیروں سے بالکلیہ دبایا نہیں جاسکتا تھا اس لئے اگر فتویٰ سے متاثر ہو کر کچھ لوگ واپس چلے گئے تو ان کی جگہ دوسرے لوگوں نے آکر پر کردی، غرضیکہ آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا، انھیں حالت میں ۲۰ صفر ۱۲۷۲ھ کو امیر المجاہدین نے اعلان کیا کہ انشاء اللہ کل بعد نماز فجر لشکرِ اسلام دریاباد سے کوچ کرے گا. اس اعلان پر مجاہدین سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے، دوسری طرف سرکاری فوج کو جب اس کی اطلاع ملی تو سرداران لشکر میں کھلبلی مچ گئی، دوڑے ہوئے امیر المجاہدین کی خدمت میں آئے کہ حاکم اعلیٰ کی مرضی کے خلاف یہاں سے آگے بڑھنا مناسب نہیں اسلئے کچھ دن اور سفر کو ملتوی رکھا جائے، امیر المجاہدین نے فرمایا کہ یہی سنتے سنتے مہینوں

گذر گئے اور بات جہاں تھی وہیں رہی اس لئے اب تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں اگر آپ حضرات کے اندر کچھ اسلامی حمیت ہے تو حسب وعدہ ہمارا ساتھ دیجئے اور اگر مجاہدین اسلام کے قتل ہی کا شوق ہے تو اسے پورا کر لیجئے، ہم نے خدا کے دین کی سربلندی کے لئے جو سر بلند کیا ہے وہ کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا، غرض اُدھر سے اصرار اور اِدھر سے انکار اسی میں ساری رات گذر گئی اور صبح ہوتے ہی ادائے نماز کے بعد کوچ کا نقارہ بج گیا اور مجاہدین اپنی اگلی منزل کیلئے روانہ ہو گئے، افسران شاہی پھر امیر المجاہدین کے پاس آئے اور رکنے کیلئے بڑی منت سماجت کی بالآخر تہور خاں سے مزید ضبط نہ ہو سکا اور اس نے راز کی بات کہہ دی کہ ایک طرف تو حاکم وقت لشکر اسلام کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور دوسری طرف آپ ہیں کہ اجودھیا جانے پر بضد ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر میری بس اتنی گذارش ہے کہ کوئی ایسی سبیل نکالی جائے کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، امیر المجاہدین نے تہور خاں کی اس بات کے جواب میں تین تجویزیں پیش کیں کہ ان میں سے کسی ایک پر عمل کر لیا جائے تو میں اپنی اس تحریک کو ختم کر دوں گا۔

(۱) ایک آدمی ہماری جانب سے اور ایک آدمی نواب وزیر کی جانب سے ہنومان گڑھی جائے اور مسجد کی جگہ ایک خط مسجد نما کھینچ کر وہاں اذان اور نماز ادا کر آئے اگر یہ منظور نہیں تو

(۲) جب تک نواب بہادر کی خواہش ہو ہم یہیں ٹھہرے رہیں گے مگر مجاہدین کے مصارف بذمۂ سرکار ہوں گے۔ اگر ہمارا یہاں قیام پسند نہ ہو تو۔

(۳) ہم اپنے پورے لشکر کے ساتھ عیش باغ (لکھنو) میں قیام کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ واجبی مصارف کی ذمہ داری سرکار قبول کرے اور اس قیام کے دوران مسجد تعمیر کرا دی جائے، مسجد تعمیر ہوتے ہی مجاہدین اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے[1]

---

[1] حدیقۂ شہدا ص ۵۰

ان مناسب اور قابل عمل شرطوں سے تہور خاں بیحد خوش ہوئے، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وزیر نواب بہادر ان متبادل شرطوں میں سے کسی ایک کو ضرور قبول کر لیں گے اور خون خرابہ کے بغیر معاملہ طے ہو جائیگا، چنانچہ انھوں نے کہا کہ میں آج ہی لکھنؤ جاتا ہوں اور نواب بہادر کو کسی ایک شرط پر راضی کر کے دو تین یوم کے اندر واپس آجاؤں گا اس مدت میں آپ یہیں قیام فرما رہیں، لکھنؤ آکر تہور خاں نے ہر چند کوشش کی کہ نواب بہادر سے اس موضوع پر گفتگو ہو جائے، لیکن انھوں نے اس کا موقع ہی نہ دیا کیونکہ انھیں تومان سنگھ اور مہنتوں نے پہلے سے اپنا طرف دار بنا لیا تھا اس لئے تعمیر مسجد کے سلسلے میں وہ کسی مصالحت پر آمادہ نہیں تھے، تہور خاں جب اپنی کوشش میں قطعی طور پر ناکام ہو گئے تو شرم و ندامت کی بنا پر مجاہدین کی طرف رخ نہیں کیا اسی دوران مجاہدین کی نگرانی پر مامور افسران نے دربار شاہی میں یہ درخواست بھیجی کہ کہ اب تک ہم نے مولوی صاحب اور ان کی جماعت کو بہت برداشت کیا، مگر اب معاملہ صبر و ضبط کی حد سے آگے بڑھ گیا ہے اس لئے ان کے متعلق کوئی قطعی حکم صادر کیا جائے، اس درخواست کے پہونچنے پر وزیر نواب نے پہلے یہ انتظام کیا کہ مجاہدین کی نگرانی پر جو سلطانی فوج متعین تھی اس میں سے مسلم سپاہیوں کا وہاں سے تبادلہ کر دیا، البتہ جن پر انھیں مکمل اعتماد تھا انھیں بحال رکھا اور ساتھ ہی ایک انگریزی پلٹن کرنل بارلو کی سرکردگی میں یہاں روانہ کر دی، اس ضروری انتظام کے بعد افسران شاہی کی عرضی کے جواب میں یہ فرمان صادر کیا گیا۔

نقل حکم نامہ بمہر کچہری خاص سلطان عالم بنام کرنل بارلو و راجہ فتح بہادر و حسین علی کپتان و علی جان سالار پلٹن علی غول و محمد بیگ او شار و امام علی و فرزند علی دار و غگان توپ خانہ و رجب خاں و نصیر خاں سالار و غیرہ افسران و حسین علی کارندہ مقیم الدولہ بہادر و ذاکر حسین منصرم علاقہ دریا آباد

بد انجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں، باقی سب صورت وہی ہے، مظلوم کُشی وہی، میدان وہی، وہی انسدادِ آب و دانہ ہے، جور و جفا کا کارخانہ ہے، وہی غریب الوطنی ہے۔ وہی ناوک فگنی ہے، وہی بے گناہی ہے، وہی قتل پر مولویوں کی گواہی ہے وہی تنہائی ہے، وہی لوگوں کی بے وفائی ہے، وہی دین کی لڑائی ہے، وہی فوج کی چڑھائی ہے، وہی سر ہے، وہی قلم ہے، وہی جور ہے وہی ستم ہے۔ ناظرین کتب سیر کے نزدیک جو حسینؓ پر گذرا تھا وہی ستم عیاں ہے، قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے یہ غلام امام ہیں، وہ پیشوائے دین تھے، پیرووں میں یہ سرِ امام ہیں لہ

لشکرِ اسلام کی بجانب اجودھیا روانگی اور مجاہدین کی شہادت!

گفت و شنید کے جب تمام مراحل گذر گئے اور حجت ہر طرح سے قائم ہو گئی نیز سرکاری افسران کی اس تازہ ستمرانی سے یہ امر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گیا کہ سرکار کا منشاء بزور طاقت اس تحریک کو کچل دینا ہے، تو امیر المجاہدین نے بھی مجاہدین اسلام کو دریا آباد سے اجودھیا کی جانب مارچ کا حکم دیا، چنانچہ ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ کو خالی شکم، تشنہ بلب، فدا کاروں کی یہ جماعت اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سرکاری فوج جو مجاہدین کے تعاقب اور ان کا راستہ روکنے کے لئے مقرر تھی، وہ خوابِ غفلت میں سرشار پڑی سوتی رہی اور مجاہدین کا سیل رواں اس کے پاس سے ہو کر گذر گیا۔ دن چڑھے انگریزی رجمنٹ کے کرنل بارلو کی آنکھ کھلی تو میدان خالی دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، بدحواسی کے عالم میں دوڑا ہوا شیخ حسین علی کے پاس آیا اور کہا کہ کسی تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر

لہ حدیقہ شہدا، ص ۵۵۔

فوراً جائیے اور حیلہ بہانہ سے مجاہدین کو آگے بڑھنے سے روکئے، اگر یہ جماعت محمد پور پہنچ گئی جو مسلمانوں کا علاقہ ہے تو پھر اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا، شیخ حسین علی حسب حکم اسی وقت روانہ ہو گئے اور شجاع گنج کے آخری کنارے پر مجاہدین سے جا ملے پیچھے سے بارلو بھی بسرعت تمام شاہی لشکر کو لے کر آ گیا، ایک طرف تو شیخ حسین علی امیر المجاہدین سے محو گفتگو تھے دوسری جانب کرنل بارلو توپیں مورچے پر جما رہا تھا اس آخری وقت میں بھی، شیخ حسین علی فریب دہی سے باز نہیں آئے۔ امیر المجاہدین کے قدموں پر اپنی پگڑی رکھ کر ملتجانہ انداز میں بولے بس ایک بار ہماری درخواست اور قبول فرما لیں اور آگے بڑھنے کے بجائے دو تین یوم کیلئے رودلی میں قیام کر لیں خدا نے چاہا تو بغیر کسی جنگ و جدال اور کشت و خون کے مسجد تعمیر ہو جائے گی، اللہ کے سچے اور مخلص بندے اپنی طرح پوری دنیا کو سچا اور مخلص سمجھتے ہیں اس لئے امیر المجاہدین ان کی باتوں میں آ گئے، اور اسی وقت اسلامی لشکر میں اعلان کرا دیا کہ آگے بڑھنے کے بجائے رودلی چلیں، شیخ حسین علی نے جب دیکھا کہ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا ہے تو وہاں سے اٹھ کر بارلو کے پاس آئے اور یہ کہکر کہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے اب آگے تم جانو سیدھے موضع بھلسر کو چل دیئے تاکہ کل کو یہ کہنے کی گنجائش رہے کہ یہ جو کچھ ہوا میری غیر موجودگی اور لاعلمی میں ہوا اگر میں موجود رہتا تو ایسا ہرگز نہ ہونے دیتا، حسین علی کے فریب سے غافل مجاہدین رودلی کے راستے پر مڑ کر جیسے ہی ایک ٹیکرے کے پاس پہنچے (جو راستہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور بارلو نے خفیہ طور پر اس کی بلندی پر توپیں نصب کر دی تھیں) تو اچانک اس پر توپ کے گولے برسنے لگے، مجاہدین اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے سراسیمہ سے ہو گئے، لیکن پھر سنبھل کر جوابی حملہ کر دیا، اور دیکھتے دیکھتے میدان کارزار گرم ہو گیا۔ امیر المجاہدین نے یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے "سر میدان کفن بردوش دارم" آگے بڑھے اور مجاہدین کو للکارا کہ آگے بڑھ کر توپوں پر قبضہ کر لو، یہ سنتے ہی

مجاہدین باز کی طرح جھپٹے اور اپنی ڈھالیں بارود اگلتی ہوئی توپوں کے دہانے پر رکھ دیں، مجاہدین کی اس بے مثال جرأت کو دیکھ کر گولہ انداز توپوں کو چھوڑ کر بھاگے، بارلو نے جنگ کا جب یہ نقشہ دیکھا تو جان بچانے ہی میں غنیمت دیکھی، زیر لب گٹ پٹ کرتا میدان سے بھاگا، اس کے فرار ہوتے ہی میدان خالی ہو گیا، لیکن بارلو نے اپنی فوج اس طرح ترتیب دی تھی کہ ٹیکرے کے ان توپوں کے پیچھے کچھ فاصلہ پر مزید توپیں نصب کی تھیں پھر ان توپوں کے عقب میں فوج دستے مقرر کر دیئے تھے، چنانچہ مجاہدین بھگوڑوں کا تعاقب کرتے ہوئے ان پیچھے کی توپوں کی زد میں آگئے تو اس نے گولہ اندازوں کو فیر کا حکم دیا، توپیں آتشیں گولے برسانے لگیں، سوئے اتفاق سے ایک چھرا امیر المجاہدین کے بازو پر لگا اور ایک ہاتھ بالکل بیکار ہو گیا، اور اس صدمے سے آپ گھوڑے سے گر پڑے، اپنے امیر کی یہ حالت دیکھ کر مجاہدین میں بے چینی پھیل گئی لیکن اس وقت امیر المجاہدین نے فی الفور اپنے آپ کو سنبھالا اور اسی زخم خوردگی کی حالت میں دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر بہ بانگ بلند فرمایا کہ مجاہدو یہ وقت جوہر دکھانے کا ہے آگے بڑھو اور ان توپوں پر بھی قبضہ کر لو، اور خود بھی زخمی شیر کی مانند غنیم کے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور کئی سرکاری سپاہیوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا دیا، اپنے امیر کی اس جرأت و ہمت کو دیکھ کر مجاہدین کے بھی حوصلے بڑھے اور پیش قدمی کرتے ہوئے ان توپوں کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا، یہ دیکھ کر سرکاری فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور مجاہدین کی کامیابی کے آثار بالکل نمایاں ہو گئے، لیکن تقدیر کے مقابلے میں تدبیر کو ہمیشہ پسپائی اٹھانی پڑی ہے، عین اس حالت میں کہ غنیم کی صفیں منتشر ہو گئی تھیں اور مجاہدین ان کے تعاقب میں تھے، شیر بہادر (تعلقدار کمیار نظامت بہرائچ) اور ٹھاکر سنگھ بہیلیہ نے کمین سے نکل کر حملہ کر دیا، یہ دیکھ کر بھاگنے والے بھی مڑ گئے، اس طرح مجاہدین دونوں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے، پھر بھی مجاہدین نے مجتمع

ہو کر جوابی حملہ کیا مگر اب جنگ کا نقشہ بگڑ چکا تھا، ظہر کے وقت جنگ کا آغاز ہوا تھا اور عصر کا وقت آتے آتے تمام مجاہدین دادِ شجاعت دیتے ہوئے آغوشِ رحمت میں پہونچ گئے، امیر المجاہدین مولانا امیر علی امیٹھوی زخموں سے چور میدان میں ایک جگہ پڑے تھے لیکن روح نے ابھی قفس عنصری کو الوداع نہیں کہا تھا کہ شیر بہادر امیر المجاہدین کی تلاش میں میدان میں پڑی لاشوں کو دیکھتا ہوا ان کے پاس پہونچ گیا اور سر مبارک کو جسم سے جدا کر دیا، بارلو کرنیل کے حکم سے شہید مظلوم کے سر کو دو شتر سوار لے کر لکھنو وزیر علی نقی کے دربار میں پہنچے، وزیر یہ دیکھ کر بہت گھبرائے اور کہا کہ سر کو یہاں کیوں لائے ہو کیا یہاں بھی ہنگامہ کرانا چاہتے ہو، پھر کہا کہ ریزیڈنٹ کو سر ملاحظہ کرا کے واپس لے جاؤ اور جسم کے ساتھ دفن کر دو، لیکن ان لوگوں نے کہیں راستہ ہی میں پھینک دیا[1] مجاہدین کی لاشیں بے گور و کفن رات بھر اسی طرح منتشر پڑی رہیں، دوسرے دن صبح کو گرد و نواح کے مسلمان جمع ہوئے اور ردولی کے چودھری کے حسب مشورہ اسی میدان میں قبریں کھود کر سب کو دفن کر دیا۔ اس معرکہ میں جانبین کے کتنے آدمی کام آئے اس سلسلے میں مورخین کے بیان متضاد ہیں، مرزا جان لکھتے ہیں کہ تقریباً پانچ سو سرکاری سپاہی اور ہنود مقتول ہوئے[2] منشی رام سہائے تمنا لکھتے ہیں کہ اس ہنگامہ میں شش صد بست و پنج (۶۲۵) ہمراہیان مولوی صاحب یکصد چند (سو سے کچھ اوپر) قوم ہنود مقتول و کشتہ ہوئے[3] مولوی نجم الغنی لکھتے ہیں ایک سو تیرہ آدمی جان سے مارے گئے، مجروحین کا حساب نہیں، مجروحین خوف جان سے آٹھ دس کوس تک بھاگے اور شیر بہادر کے آدمیوں نے کپتان بارلو کے حکم سے ان کا تعاقب کر کے تمام مجروح مفرورین کو تہ تیغ کیا[4]

---

۱ تاریخ اودھ، ص ۹۷، ج ۲ - ۲ حدیقۂ شہدا، ص ۶۰ - ۳ افضل التواریخ، ص ۱۱۲ -
۴ تاریخ اودھ، ص ۹۸ -

عین معرکہ کے وقت امیر المجاہدین کی زبان پر بے ساختہ یہ مصرعہ جاری ہو گیا تھا۔ "سر میداں کفن بر دوش دارم"۔ بعد از شہادت جب لوگوں نے غور کیا تو اسی سے تاریخ شہادت برآمد ہو گئی، منشی ظہیر الدین بن منشی مسعود بلگرامی نے اس کی یوں تضمین کی۔

بتاریخ شہیدانِ کفن پوش
چہ حاجت تا سننش من بر نگارم
کہ خود فرمود آں میر شہیداں
سرِ میداں کفن بر دوش دارم
۱۲ ۷۲

عبدالرحیم خاں مسکین نے ان الفاظ میں تاریخ لکھی۔

مسلمان و کفار در باب دیں — ہوئے جنگ آرا یہ دونوں فریق
عیاں کربلا کا ہوا معرکہ — وہی سب طریقہ وہی سب طریق
پیاسے شہیدوں کی تاریخ ہے — رحیق رحیق رحیق رحیق
جو ناری ہوئے تحت تیغ انکا سال — حریق حریق حریق حریق [1]
۱۲ ۷۲

غلام حسین اودھی کی تحریک کو پامال کرنے کے تقریباً ساڑھے تین ماہ بعد سینکڑوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر کے بازیابی مسجد کی اس دوسری جدوجہد کو بھی بزور طاقت کچل دیا گیا، لیکن بقول شاعر ؎

ظلم ظالم کا بہر شکل نہیں ہوتا دراز
مورچہ کھا گیا دو روز میں تلواروں کو

---

[1] حدیقۂ شہدا، ص ۶۹۔

اِدھر تو مورخہ ۲۶ رصفر ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ رنومبر ۱۸۵۵ء کو دین و مذہب اور قانون وانصاف سب کو بالائے طاق رکھ کر محض زور مال اور جاہ ومنصب کی خاطر بے گناہوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا اُدھر برطانیہ کی پارلیمنٹ میں اسی تاریخ کو سلطنت اودھ کی ضبطی کا فیصلہ ہورہا تھا۔

مشہور ہے کہ ضبطیٔ حکومت کے اس فیصلہ سے پریشان ہوکر نواب بے ملک نے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

العظمۃ للہ

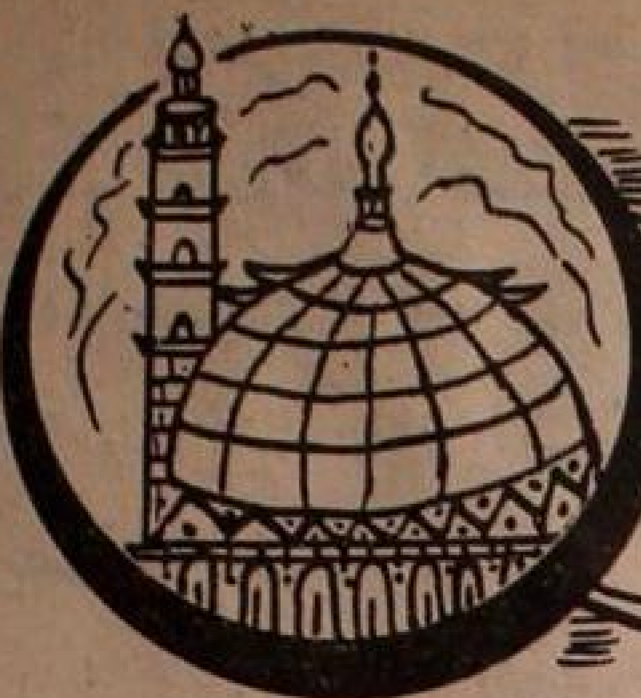

مسجد الہ جائی گھاٹ

یہ مسجد کب اور کس نے بنوائی اس بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہو سکی، دریائے گھاگھرا کے ساحل پر ایک بلند قطعہ آراضی میں یہ پر شوکت اور عالیشان مسجد واقع تھی، اس کے باقیات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے عہد کی ایک یادگار مسجد تھی، جس کی تعمیر پر خصوصی اہتمام کیا گیا تھا، اونچی کرسی، مضبوط و مستحکم دیواریں اور بلند و بالا مینارے دور ہی سے دیکھنے والے کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لیتے ہوں گے، اس وقت پوری مسجد گردش لیل و نہار کی نذر ہو چکی ہے، البتہ پچھلی دیوار اور سامنے کے دو در اب بھی کھڑے زبان حال سے باشندگان اجودھیا کی بے اعتنائیوں کا شکوہ کر رہے ہیں۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں رام شاستری نامی ایک شخص نے مسلمانوں کی بے توجہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مسجد کے شمالی پشتہ سے بالکل ملحق ایک مکان کی بنیاد ڈال دی اور بسرعت تمام اس کی دیواریں بھی بنالیں جس کی شکایت حکام سے کی گئی، تو ڈپٹی کلکٹر نے قانوناً یہ تعمیر روک دی، اور ساتھ ہی یہ حکم جاری کر دیا کہ مسجد کی عمارت انتہائی مخدوش ہو گئی ہے اگر مسلمانوں نے اس کی مرمت نہ کی تو اسے نیلام کر دیا جائیگا، اس حکم پر سید ضامن تحصیلدار نے شکست و ریخت کی مرمت کا بیڑا اٹھایا اور مسلمانوں سے چندہ کر کے مرمت اور منہدم حصوں کی تعمیر کا کام شروع کرادیا،

پہلے مسجد کا احاطہ جو زمیں بوس ہو چکا تھا بنوایا، اس کے بعد جنوبی برج کی تعمیر میں ہاتھ لگایا گیا، یہ برج بھی مکمل طور پر گر گیا تھا اور ملبہ عرصہ سے راستہ میں پڑا ہوا تھا جس سے راہگیروں کو پریشانی ہوتی تھی، لیکن برج کا کام شروع ہوتے ہی رام شاستری کی آتش غضب بھڑک اٹھی، اور راجہ مان سنگھ کے پاس جا کر ان کا کان بھرا، راجہ مان سنگھ خود اہل اسلام اور اسلامی آثار سے نفرت کرتے تھے اسلئے رام شاستری کے برانگیختہ کرنے پر ان کی رگ تعصب میں خون دوڑ گیا، فی الفور انھوں نے ایک سازش رچی اور ایک عرضداشت اس مضمون کی تیار کرائی کہ "مسلمانان اجودھیا مسجد الہ جائی گھاٹ کی جو مندروں کے درمیان میں واقع ہے از سر نو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جسے وہاں کے ہندو قطعی طور پر پسند نہیں کرتے اور اس تعمیر کو روکنے کے لئے ہندوؤں کا ایک بہت بڑا مجمع اجودھیا میں اکٹھا ہو گیا ہے اگر مسجد کی تعمیر کا کام رد کا نہیں گیا تو ۱۸۵۵ء بعہد نواب واجد علی شاہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو خوں ریز بلوہ ہوا تھا اس سے بھی زیادہ مہلک فساد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔" پہلے تو یہ عرضی مختلف لوگوں کے نام سے بذریعہ ڈاک کمشنر کے پاس بھجوائی بعد ازاں خود کمشنر کے دربار میں پہنچے اور طے شدہ سازش کے مطابق ان کی موجودگی میں ہی کچھ اور لوگ بھی عرضی لے کر کمشنر کے پاس پہنچ گئے، راجہ مان سنگھ نے وہ عرضیاں پڑھ کر کمشنر کو سنائیں، پھر مغموم و مضطرب صورت بنا کر خاموش و ساکت بیٹھے رہے ان کی اس رنجیدگی کو دیکھ کر کمشنر صاحب نے پوچھا راجہ صاحب خیریت تو ہے، ان عرضیوں کی وجہ سے آپ اس قدر متفکر کیوں ہیں، راجہ صاحب نے جواباً عرض کیا کہ ان عرضیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی مرمت کی وجہ سے اجودھیا کے امن و امان کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور ہماری ذرا سی غفلت سے پورا اجودھیا خون میں ڈوب جائے گا اس لئے اس تعمیری کام پر بندش لگانے کے علاوہ خود میرا اس موقع پر اجودھیا میں

موجود رہنا بقائے امن کے لئے ضروری ہے، چونکہ اس وقت تمام راجگان کی کلکتہ میں طلبی تھی اور راجہ کے ذمہ سرکاری بقایا تھا، اس لئے بہانہ کی تلاش میں تھے کہ کسی طرح کلکتہ کی حاضری سے نجات مل جائے، چنانچہ انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے سردست کلکتہ نہ جانے کی کمشنر صاحب سے اجازت بھی لے لی اور مسجد کی مرمت کا کام بھی رکوا دیا۔ بعد میں مسلمانوں نے اجودھیا کے منصف مزاج ہندوؤں کے اشتراک سے عدالت میں درخواست پیش کی کہ مسجد کی مرمت پر یہاں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور کمشنر صاحب کی خدمت میں جو عرضی پیش کی گئی ہے وہ فرضی اور قطعی من گھڑت ہے اس لئے مسجد کی مرمت کے کام پر جو بندش عائد کی گئی ہے اسے ختم کر دیا جائے، لیکن راجہ صاحب کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مسلمانوں کی یہ درخواست بے سود رہی اور حکم امتناعی بحالہ باقی رہا، جس کے نتیجے میں یہ عالیشان مسجد دھیرے دھیرے بالکل منہدم ہو گئی۔[1]

---

[1] گم گشتہ حالات اجودھیا، ص ۲۶۔

مسجد امیر الدولہ

یہ عالیشان مسجد نواب آصف الدولہ کے نائب امیر الدولہ حیدر بیگ نے ۱۲۰۰ھ میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے اندر موجود درج ذیل کتبہ بانی مسجد اور تاریخ تعمیر دونوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

بعہد شاہِ عالم والئ ہند — وزیرِ مملکت یحییٰ خاں شد
امیر الدولہ اوراشد چوں ثابت — درا توفیقِ صبرِ بیکراں شد
درانجا مسجد عالی بنا کرد — کہ جائے طاعتِ دیں پروراں شد
خیال سال تاریخش نمودم — "محلِّ ذکر رب" تاریخ آں شد

اس مسجد سے ملحق جنوبی سمت چہار دیواری سے گھرا وہ احاطہ آج بھی موجود ہے جو کبھی اس مسجد کا ایک حصہ تھا، اس وقت یہ احاطہ بیراگیوں کے قبضہ میں ہے جس کے ایک بڑے حصہ میں کاشت کی جاتی ہے، اور تھوڑے سے رقبہ پر پھولوں کا باغیچہ ہے۔ احاطہ کے اندر مشرقی جانب ایک مقبرہ ہے جو مسجد کے بانی امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا مدفن بتایا جاتا ہے۔ اس وقت یہ مقبرہ انتہائی خستہ حالت میں ہے اور دنیا کی ناثباتی کا زبانِ حال سے اظہار کر رہا ہے۔

باب سوم

قابلِ ذکر مزارات اور مقبروں کی تفصیل

یہ تربت ہاشمی ہے ان حجازی شہسواروں کی
مسلمانوں نے مٹی بیچ لی جن کے مزاروں کی

۱

مزار حضرت شیث علیہ السلام

حضرت شیث علیہ السلام کے متعلق مشہور محقق، مفسر، محدث اور مورخ حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت آدم کی اولاد میں سلسلۂ نسب صرف حضرت شیث علیہ السلام سے چلا ہے، شیث کے معنی ہبۃ اللہ یعنی عطیۂ الٰہی کے ہیں، کیونکہ ان کی ولادت ہابیل کی شہادت کے بعد عطیۂ خداوندی کی صورت میں ہوئی تھی، اس لئے ان کا نام شیث رکھا گیا۔[1]

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی نے بھی اپنی معرکۃ الآرا تفسیر میں یہی بات لکھی ہے کہ شیث علیہ السلام، حضرت حوا کے بطن سے عام عادت کے برخلاف اکیلے پیدا ہوتے تھے، اور ان کا نام ہبۃ اللہ ہے کیونکہ ان کی پیدائش کے وقت جبریل علیہ السلام نے حضرت حوا سے کہا تھا۔ ھذا ھبۃ اللہ لک بدل ھابیل "یہ بچہ اللہ کا عطیہ ہے جو آپ کو ہابیل کے بدلہ میں دیا گیا ہے۔ اور شیث علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس[۱۳۰] سال تھی۔[2]

اس موقع پر ہمیں حضرت شیث علیہ السلام کی حیات طیبہ پر گفتگو نہیں کرنی ہے بلکہ صرف ان کے مزار کے متعلق اہل تاریخ کی نقول پیش کرنی ہیں، ظاہر ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کا عہد ابتدائے عالم سے تعلق رکھتا ہے اور تاریخ کا دامن اس وقت کی معلومات سے یکسر خالی ہے، اس لئے مورخین نے اس سلسلے میں کتب سماویہ کا سہارا لیا ہے، چونکہ قرآن حکیم حضرت شیث علیہ السلام کے حالات واقعات کے بارے میں بالکل خاموش ہے، اس لئے اب تمام تر مدار توراۃ اور انجیل پر رہ جاتا ہے لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنی ان کتابوں میں اس قدر تحریف اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۹۴ - [2] الجامع لاحکام القرآن ج ۶ ص ۱۳۴

تبدیلی کر دی ہیں کہ ان کی تصریحات سے اعتماد اٹھ گیا ہے، اس لئے حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کی تعیین کے متعلق تاریخ کے بیانات قطعی اور یقینی نہیں کہے جا سکتے بلکہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور اسی گنجائش کی بنا پر خود مورخین اس باب میں مختلف نظر آتے ہیں، چنانچہ بعض نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار بعلبک میں ہے، اور بعض کوہِ آدم میں بتاتے ہیں، ان دونوں اقوال کے برخلاف مورخین اور علماء کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ آپ کا مزار ضلع فیض آباد کے مشہور وقدیم قصبہ اجودھیا میں ہے، اجودھیا کے ایک بزرگ مولوی عبدالکریم نے بہت سارے حوالے اپنی کتاب "تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء" میں اکٹھا کر دیا ہے جسے ان کے نبیرہ مولوی عبدالغفار بن مولوی عبدالقادر نے "گم گشتہ حالات اجودھیا" میں نقل کیا ہے۔ مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی بھوپال نے بھی اپنی تالیف "ہندوستان اسلام کے سائے میں" کے اندر اپنی جانب سے کچھ اضافہ کے ساتھ مولوی عبدالکریم صاحب کی فراہم کردہ معلومات جمع کر دی ہیں، ہم اس جگہ مولانا وجدی ہی کے الفاظ میں اسے نقل کر رہے ہیں۔

(۱) ان کا (حضرت شیثؑ) مزار بقول مولوی عبدالکریم اجودھیا ضلع فیض آباد میں ہے، یہ مزار مبارک اس ٹیلے کی دکھن جانب ہے جس کو اہل ہنود منو پربت کہتے ہیں، یہاں سالانہ بڑا میلہ لگتا تھا، اہل تحقیق سنسکرت نے بتایا ہے کہ منو کے معنی آدم کے ہیں (مدینۃ الاولیا)۔

راقم السطور (مولانا وجدی) عرض کرتا ہے کہ منو کے معنی آدم کے ہیں اسی سے آج کل منش یعنی آدمی مانوتا یعنی آدمیت وانسانیت شائع وذائع ہے اسی لئے منو پربت کا مطلب کوہِ آدم کے ہیں، کیونکہ حضرت شیث علیہ السلام آدم ثانی ہیں اس لئے اس نام سے یہ پہاڑی موسوم ومشہور ہوئی۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری شہادت تواریخ انبیاء[1] علیہم السلام مطبوعہ ۱۸۶۸ء کی ہے، اس کے اندر لکھا ہے کہ حضرت شیثؑ کو اُوریائے اول کہتے ہیں، شیث ترجمہ ہے ہبۃ اللہ کا، حق تعالیٰ نے حضرت شیثؑ پر پچاس صحیفے نازل کئے تھے، ان کے زمانے میں اکثر لوگ راہ راست پر تھے، کچھ لوگوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی تھی، بعض ارباب سیر کے نزدیک حضرت شیثؑ کی ولادت گاہ ملک شام تھی اور قبر ان کی شہر اودھ میں ہے۔

(۳) علامہ شہاب الدین دولت آبادی (المتوفی ۸۴۸/۸۴۹ھ) نے اپنی کتاب خلاصۃ الوقائع میں حضرت شیثؑ کی قبر کے اودھ میں ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

(۴) اسی طرح علامہ ابوالفضل (المتوفی ۱۰۱۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب آئین اکبری میں لکھا ہے کہ حضرت شیث اور حضرت ایوب علیہما السّلام کی قبر اودھ میں ہے۔

(۵) پانچویں شہادت مشہور بزرگ و محقق محدث دہلوی (شیخ عبدالحق) کی قلمی کتاب خلاصۃ الاحادیث میں یہ اثر درج ہے

قال ان فی الھند بلدۃ اسمھا اودہ فیھا قبرا لنبیین شیث وایوب علیھما السلام فی التل[2]

فرمایا کہ ہندوستان میں ایک شہر ہے جس کا نام اودھ ہے اسکے اندر دو نبیوں حضرت شیث اور حضرت ایوبؑ کی قبریں ہیں۔

---

[1] تواریخ انبیاء منشی سرفراز خاں دہلوی کی مرتبہ ہے جو دہلی کے علماء کی تصحیح و تصدیق کے ساتھ دہلی سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی تھی

[2] یہ اثر موضوع ہے، نیز شیخ عبدالحق محدث کی مطبوعہ و قلمی کتابوں میں خلاصۃ الاحادیث کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا ہے، اس لئے یہ حوالہ بجائے خود تحقیق طلب ہے۔

(۶) عجائب القصص[1]، صفحہ ۱۶ پر درج ہے کہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ قبر شریف حضرت شیث ؑ شہر اودھ ہند میں ہے، یہ عبارت اصل نسخہ فارسی اور اس کے اردو ترجمہ دونوں میں موجود ہے۔

(۷) دہلی کے مشہور مصنف اور مناظر ابوالمنصور مولوی سید ناصر الدین صاحب نوید جاوید نے اپنی کتاب سراج الہدایہ میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں "در ہند شہر یست کہ اورا اودھ گویند میاں دو بلندی قبر دو نبی یعنی شیث ؑ وایوبؑ اند" (سراج الہدایہ ص ۳۸۶، ص ۳۹۰) یعنی ہندوستان میں ایک شہر ہے جس کو اودھ کہتے ہیں وہاں دو ٹیلوں کے درمیان دو نبیوں کی قبریں ہیں یعنی حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی۔

(۸) تاریخ جائس مصنفہ سید عابد حسین سہرامی مطبوعہ جلالی پریس الہ آباد ۱۲۸۵ھ اور نجم الوجدان مصنفہ مولوی نجم الدین آفندی نے اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے: "شہر اودھ کے بانی حضرت شیث ؑ خلف حضرت آدم ہیں، اس کے بعد حام ابن نوحؑ نے اودھ کو آباد کیا پھر ہندو راجاؤں کا تخت گاہ بنا، جس کے بعد مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہوا۔

(۹) تواریخ نوادر العصر جغرافیہ ملک اودھ صفحہ ۱۴ مطبوعہ نول کشور پریس ۱۸۶۳ء تذکرہ فیض آباد میں یہ عبارت درج ہے۔

"فیض آباد کے پاس دو بڑی قبریں ہیں ان کا طول سات سات، آٹھ آٹھ گز سے کم نہ ہوگا، عوام ان کو حضرت شیث ؑ وایوبؑ کی قبروں سے منسوب کرتے ہیں۔"

---

[1] یہ کتاب مولانا عبدالواحد بن عبدالغنی کی تصنیف بزبان فارسی ہے جس کے اندر بارہ حضرات انبیاء کے حالات درج ہیں اس کا ترجمہ اسی نام سے مولوی فخرالدین دہلوی نے کیا تھا۔

(۱۰) نظام الدولہ سفیر کشمیر نے جب ۱۸۷۶ء میں اس نواح کا دورہ کیا تو ایک مراسلہ اودھ اخبار میں ان مقامات کی زیارت پر اپنے تاثرات کو چھپوایا تھا جس کے اندر لکھا ہے۔

" حضرت شیث ؑ کی قبر کسی نے بعلبک میں لکھی ہے، اور کسی نے کوہِ آدم واقع سراندیپ پہلوئے حضرت آدم میں، مگر چند سال ہوئے جب مجھے اجودھیا قریب فیض آباد آپ کی قبر ہونا معلوم ہوا تو بغرض تحقیق حج سے واپس ہو کر وہاں گیا اور قبر موصوف کو موجود پایا، ہر آدمی سے متفق اللفظ یہی سنا کہ آپ کی قبر ہے، سب ہندو مسلمان، خواص و عام پشت در پشت سے یہی سنتے چلے آرہے ہیں اور تین ناموں سے پکارتے ہیں (۱) شیث (۲) شیث دیوتا (۳) شیث پیغمبر۔ فیض آباد سے جس کا قدیم نام بنگلہ ہے اجودھیا جس کا نام اودھ مشہور ہے تین کوس ہے اور وہ دریائے گھاگھرا یا سرجو کے کنارے کی بستی ہے۔ ...... ہندو کا کوئی پیشوا بجز سیس ناگ کے اس نام کا نہیں گذرا، اور شیث کے ساتھ لفظ ناگ کا کا لنجر مشہور ہے، اور اس مذہب میں رسم جلانے کی ہے نہ کہ قبر کا، اس لئے ہم کو کیا بلکہ ہنود کا بھی ذرا گمان اس کا نہیں ہے کہ یہ کسی بیرون پیشواؤں کی قبر نہ ہو، لہذا اس میں کچھ بھی شک نہیں ہے کہ یہی قبر حضرت شیث علیہ السلام کی ہے ...... قبر شیث علیہ السلام بستی سے ایک میل باہر ہے، اب خدا جانے کہ اس وقت بستی میں تھی یا بستی سے باہر اسی قدر دور تھی۔ فی الحال وہاں بجز باغات اور عام قبرستان کے نشان آبادی پایا نہیں جاتا، مگر گوشۂ شمال و مغرب میں فی زمانہ ایک قریہ بنام برٹھ آباد ہے طول اس قبر کا پونے سات گز ہے اور عرض ڈیڑھ ذرع (ہاتھ) اور گرداگرد ایک پختہ احاطہ ہے اور قبلہ رو ہے، اس سے یہ گمان نہیں ہوتا کہ عہد تسلط میں مسلمانوں نے قبلہ رخ بنا دی ہو اسلئے کہ اول بانیٔ قبلہ حضرت آدم علیہ السلام اور قبل نبوت آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی قبریں اب تک مکہ معظمہ میں قبلہ رو ہی موجود ہیں، مگر یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ یہ قبر مسلمانوں ہی کے عہد میں بنی ہے۔ مگر یہ ایک قبر علیحدہ بنائی گئی ہے، اور غور سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل قبر سرہانے بقدر چالیس گز مثل ایک ٹیکرہ کے موجود ہے، ان دونوں کے درمیان خواہ انقلاب زمانہ یا برساتوں سے وسط کا قطعہ نیچا ہوگیا ہے، یا بروقت بنانے احاطہ کے ہموار نیچا کر دیا گیا ہے، سرہانے کے بڑے ٹیکرے کا نام فی زمانہ منی پربت یا منو پربت یا اوڈیا جھاڑ ہے۔ منو پربت اگر پرانا نام ہے تو منو آدم کو کہتے ہیں اور حضرت شیث علیہ السلام آدم ثانی اور ہند میں گویا بجائے حضرت آدم علیہ السلام کے تھے اس لئے ان کے مناسب حال نام ہے، اور اوڈیا زبانِ سریانی میں نام حضرت شیث علیہ السلام (کا ہے) یعنی اوڈیا صاحبِ علم کو کہتے ہیں، اور یہی ایک دلیل اثبات قبر حضرت شیث علیہ السلام ہے، اب رہا حضرت شیث علیہ السلام کا اس شہر میں وفات پانا، تو یہ مسلم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام عدن (بہشت) سے سراندیپ میں اترے، اور اکثر ہند میں رہے اور ہند سے کعبہ جا کے حج وغیرہ کئے اور پھر واپس آئے، اس حالت سے یا باقی کے مناسب ہند ہی قابل سکونت آدمؑ ٹھہرے گا، نہ کوئی برفستان یا سرد گرم ملک یا شہر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہند اور چین میں نسل انسان زیادہ ہے اور علم و ہنر کا مبدأ بھی یہی ملک ہے، یہیں حضرت شیث علیہ السلام خلیفہ حضرت آدمؑ ہوئے گو اکثر وہ شام میں رہے مگر سلسلہ قیام سابق باعث سے ہند میں آنا اور رہنا ان کا قریب عقل ہے۔ .... اہل بصیرت کو زیارت قبر سے برکت اور اثر جو بزرگوں کے مزار سے ہوتا ہے اس متبرک قبر پر معلوم ہوگا، مجھے کیفیت علم اور انس معلوم ہوئی، غرض باایں ہمہ بے سروسامانی و ویرانی ایک شانِ جمال پیدا ہے[1]

---

[1] نظام الدولہ سفر کشمیر کا یہ مفصل بیان گم گشتہ حالات اجودھیا سے ماخوذ ہے کیونکہ ہندوستان اسلام کے سائے میں نقل اصل کے مطابق نہیں ہے۔

(۱۱) ایسے ہی مولانا عنایت علی جو ایران کے زبردست مجتہد تھے، جو مزار پر انوار کی زیارت کو ۱۸۸۰ء میں تشریف لائے تھے انھوں نے بھی حضرت شیث کے موجود مزار کے مقام اودھ میں ہونے کی تصدیق کی

(۱۲) صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کے نبیرہ شاہ انور علیؒ "انتصاح عن ذکر اہل الصلاح" میں لکھتے ہیں کہ "شہر اودھ بناکردہ آدم علیہ السلام ہے اور اس شہر میں قبر حضرت شیثؑ کی ہے، اسی طرح شیخ الاسلام عبدالرحمٰن جانباز قلندر نے بھی اپنی بعض تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

علاوہ ازیں جامع التواریخ، ناسخ التواریخ، تاریخ کاشفی، بہار الانوار، ملا باقر مجلسی، گلزار ابرار غوثی حسن، سیر المتأخرین غلام حسن اور مہر نیمروز مؤلفہ مرزا غالب میں بھی ان قبروں کا تذکرہ ہے۔

مزار کا جائے وقوع اجودھیا سے فیض آباد جاتے ہوئے ریلوے کراسنگ سے ایک کچی سڑک دکھن سے پورب جاتی ہے اس پر ایک فرلانگ چلنے کے بعد مزار شیثؑ کا قبرستان ملتا ہے، تلئی نالہ کے پل سے دکھن کی سمت تھوڑی دور کے فاصلہ پر درگاہ حضرت شیثؑ ہے، درگاہ میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو پورب اور پچھم بڑے بڑے ٹیلے نظر آئیں گے۔ قبر شریف انھیں دو ٹیلوں کے درمیان ہے۔

درگاہ حضرت شیث کا احاطہ صاحب مدینۃ الاولیاء مولوی عبدالکریم نے لکھا ہے کہ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ جس زمانے میں سکندر شاہ لودھی اودھ میں قیام پذیر تھا، اسی زمانہ میں اس نے اودھ میں قلعہ، ایک مسجد اور درگاہ کے احاطہ کی تعمیر کرائی تھی اور قبر شریف کو بھی اسی وقت پختہ کرا دیا تھا[1]

---

[1] یہ ساری تفصیلات گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۶ تا ۱۰ اور ہندوستان اسلام کے سائے میں از ص ۱۱۲ تا ۱۲۰ سے قدرے حذف کے ساتھ ماخوذ ہیں۔

تاریخ فرشتہ میں سلطان سکندر لودھی کے اجودھیا میں آنے کے متعلق یہ عبارت ہے ودیگرہ بارہ باربک شاہ را در جونپور گذاشتہ مراجعت نمود ددر نواحی اودھ قریب یکماہ بسیر وشکار گذرانید[1] یہ عبارت ۸۹۷ھ کے واقعات کے ضمن میں ہے اس لئے قرین قیاس ہے کہ اسی زمانہ میں یہ تعمیرات اس کے حکم سے وجود میں آئی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲)

مزار خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء

درگاہ حضرت شیث علیہ السلام کے احاطہ کے باہر جنوب کی سمت ٹیلے کی بلندی پر جہاں آج بھی سیکڑوں سال پرانے املی کے درخت موجود ہیں ان درختوں کے درمیان ایک انتہائی کہنہ پختہ چبوترہ ہے جس پر ایک بوسیدہ قبر ہے، جس کے بارے میں اجودھیا کے مسلمان متفقہ طور پر کہتے ہیں آباواجداد سے یہی سنتے چلے آرہے ہیں کہ یہ حضرت محبوب الٰہی شیخ نظام الدین قدس سرہٗ کے ایک خلیفہ کا مزار ہے صاحب گم گشتہ نے یہی لکھا ہے کہ یہ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ کا مزار ہے جن کا نام بزرگوں سے سنا تھا مگر اب یاد نہیں رہا[2]

(۳)

مزار پاتی شاہ

سری رام اسپتال اجودھیا کے پورب جانب اور کھرونیا تالاب کی اتر سمت حضرت پاتی شاہ کا مزار ہے جو اپنے زمانہ میں اجودھیا کے اہم مشائخ میں سے

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۴۲ مقالہ دوم ۸۹۷ھ [2] گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۱۔

تھے، آپ کے مزار کے جنوب میں اب سے تقریباً ایک صدی قبل اس جگہ ایک بڑے خانقاہ کے آثار موجود تھے، چنانچہ مولوی عبدالکریم انصاری اودھی نے تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ خانقاہ کے نشانات پختہ احاطہ اور اس کا بڑا دروازہ یہ سب آثار اب تک موجود ہیں" لیکن اس وقت ان میں سے کسی چیز کا بھی نام ونشان باقی نہیں ہے، اجودھیا کے لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ زمانہ قدیم میں ایک وسیع قبرستان تھا، جس میں ہزاروں پختہ قبریں تھیں مگر اس وقت نہ وہ قبرستان ہے اور نہ اس میں موجود پختہ قبریں، البتہ ایک مسجد کے کچھ آثار اب تک موجود ہیں، اس کے علاوہ خانقاہ اور اس سے ملحقہ قبرستان کھیت اور باغات میں تبدیل ہوچکے ہیں۔

(۴)

مزار حضرت قطب شاہ

آپ حضرت باقی شاہ کے خلیفہ وجانشین تھے۔ فیض آباد اجودھیا روڈ پر سری رام اسپتال کی پورب جانب ایک قبرستان میں آپ کا مزار آج بھی موجود ہے، عام طور پر پنجشنبہ کو لوگ ان کے مزار پر کثرت سے فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں، اجودھیا میں قطب شاہ کی کرامتیں آج بھی لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ آپ کے انتقال کو ڈھائی صدیاں گذر چکی ہیں، واللہ اعلم بالصواب[1]۔

(۵)

مزار شاہ بدیع الدین

اس وقت جس مقام پر برلا مندر ہے، زمانہ ماضی میں یہ قطعہ اراضی ایک

---

[1] گم گشتہ حالات اجودھیا ص ۱۱۔

قبرستان تھا جس کے متولی شاہ محبوب نامی ایک صاحب تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے لڑکے عظیم اللہ شاہ نے قبرستان کو فروخت کر دیا، اسی قبرستان کے شمال میں ہنومان گڑھی کا محلہ ہے، اس قبرستان کے باغ میں حضرت شاہ بدیع الدین کا مزار ہے، باغ تو نہ جانے کب کا ختم ہو چکا البتہ مزار خستہ حالت میں اب تک موجود ہے، صاحب گم گشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ بدیع عہد عالمگیری کے مشہور عالم و شیخ تھے اور آپ کا اصل وطن جونپور تھا۔

⑥ مقبرہ تین درویش

قصبہ اجودھیا کی موجودہ کوتوالی کی عمارت سے ملحق مشرق سے ایک گلی جنوب کی سمت گئی ہے، اس گلی میں دس پندرہ میٹر چل کر بائیں ہاتھ ایک وسیع میدان ملے گا جس میں آپ کو ایک عالی شان مقبرہ نظر آئے گا، اس میں تین قبریں ہیں اسی بنا پر یہاں کے عوام اسے مقبرہ تین درویش کہتے ہیں، یہ تینوں درویش کس زمانہ میں تھے، ان کا علمی و روحانی مقام کیا تھا، یہ باتیں صیغۂ راز میں ہیں اور اس راز سے پردہ اٹھنے کی اب بظاہر کوئی صورت نہیں ہے، ان مزارات کے قریب جلی ہوئی اگربتیوں کی راکھ اور تیلیاں اتنا ضرور پتہ دیتی ہیں کہ اہل اجودھیا اس مقبرہ کے ساتھ حسن عقیدت کا معاملہ کرتے ہیں۔

⑦ روضہ زین العابدین

محلہ پانجی ٹولہ سے جو سڑک اجودھیا ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اس کے تراہے

پر مقبرہ تین درویش ہی کے طرز پر ایک عظیم الشان مقبرہ ہے جسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ اور مقبرہ تین درویش ایک ہی زمانہ میں ایک ہی معمار کے ہاتھوں بنائے گئے ہیں، اس مقبرہ کو یہاں کے لوگ مقبرہ زین العابدین کے نام سے پکارتے ہیں، ماضی میں یہ مقبرہ بجلیا شہید کے نام سے موسوم تھا، چنانچہ گم گشتہ حالات اجودھیا میں اس کا تذکرہ مقبرہ بجلیا شہید ہی کے عنوان سے کیا گیا ہے، مقبرہ کی یہ عمارت آج بھی اچھی حالت میں ہے، ماہ شعبان کی ۲۴ تاریخ کو اس کا عرس بھی ہوتا ہے، مقبرہ کے دروازہ کے سامنے مغرب سمت تقریباً ساٹھ ستر میٹر فاصلے پر ایک قدیم مسجد ہے جس کے صحن میں ایک قبر ہے جسے صاحب گم گشتہ نے حضرت بنی نبا کی قبر بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

⑧ نوگزی قبر

مقبرہ تین درویش کی دکھن جانب تقریباً سو میٹر پر وہ مشہور قبر ہے جو نوگزی کے نام سے مشہور ہے، اور اسی قبر کی نسبت سے اس محلہ کو محلہ نوگزی کہا جاتا ہے، یہ مشہور و معروف قبر اگرچہ نوگزی کے نام سے جانی جاتی ہے مگر پیمائش میں چودہ گز سے بھی زیادہ ہے، صاحب گم گشتہ نے اس کا طول اٹھارہ گز بتایا ہے یہ نوگزی قبر جس قبرستان میں واقع ہے اسے بنی نوح کا قبرستان کہا جاتا ہے اس قبرستان کی وسعت کو گم گشتہ حالات اجودھیا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے، (یہ قبرستان) اس قدر وسیع ہے کہ اس کی مغربی حد تالاب ایٹوا اور مشرقی حد لب دریائے گھاگھرا، حدِ جنوبی بازار رانی گنج، حد شمالی موضع میراں پور و محلہ سورگ دواری۔ فی الحال میدان تو ہے مگر اس کی وہ وسعت جو بیان کی گئی ہے باقی نہیں

رہی، اس میدان میں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں، اور لوگ اسے قضائے حاجت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یہ واقعی کسی کی قبر ہے یا یوں ہی بنا دی گئی ہے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، مولوی عبدالغفار اودھی نے لکھا ہے کہ بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ آدمی کی قبر نہیں ہے، بلکہ اس میں حضرت نوحؑ کی کشتیوں کے ٹکڑے دفن ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ہند کی قبر ہے۔ واللہ اعلم۔

(۹) مزار خواجہ کرڑے شاہ

پرمودین چھوٹی کٹیا مندر کے باہر داہنے ہاتھ مندر کے احاطہ کی پوربی دیوار کے نیچے ایک پختہ قبر ہے جسے یہاں کے لوگ خواجہ کرڑے شاہ نامی کسی بزرگ کی قبر بتاتے ہیں، یہاں کے لوگوں کا بیان ہے کہ آج بھی جب کسی بیراگی کو کوئی مرض اور تکلیف لاحق ہو جاتی ہے تو اس قبر پر عطر کا پھایا رکھ کر اور اگربتیاں سلگا کر اپنی صحت کے لئے درخواست کرتا ہے تو آپ کی توجہ سے اللہ تعالیٰ مریض کو شفا دیتا ہے، لیکن مزار کی حالت دیکھ کر یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مزار کے آس پاس کوڑا کرکٹ اور جانوروں کی غلاظت کا انبار لگا ہوا ہے اگر انھیں واقعی اس مزار سے یہ عقیدت ہوتی تو اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس مزار کی اہمیت ان کے نزدیک کچھ نہ کچھ ضرور ہے، ورنہ اس جگہ کی دوسری قبروں کی طرح اسے بھی مسمار کر دیتے اور آج اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہتا۔ کرڑے شاہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ کون بزرگ ہیں، اور کس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

۱۰

مزار حافظ امان اللہؒ

محلہ یکہ ریا ٹولہ میں لب سڑک ایک مسجد کے صحن میں حافظ امان اللہ نامی ایک بزرگ کا مزار ہے، حافظ صاحب مرحوم عالم و فاضل اور صاحب فیض بزرگ تھے، تاحیات اسی مسجد میں توکلاً علی اللہ شہر کے شرفار کے بچوں کو قرآن و دینیات کی تعلیم دیتے رہے، آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دن آپ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے کہ نواب آصف الدولہ کی سواری آپ کے قریب سے گذری مگر آپنے اسکی طرف بالکل التفات نہیں کیا، اور اسی حالت میں بیٹھے تلاوت میں مشغول رہے، آپ کے اس انہماک اور قرآن کے ساتھ شغف کو دیکھ کر آصف الدولہ بہت متاثر ہوا اور سواری سے اتر کر کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا، آپ نے چند رسائل بھی تالیف کئے تھے۔

۱۱

مقبرہ شاہ ابراہیم

مسجد امیر الدولہ (جس کا ذکر مساجد کے باب میں گذر چکا ہے) سے چند قدم شمال میں بائیں ہاتھ پر ایک بلندی پر حضرت شاہ ابراہیم کا عالی شان مقبرہ ہے اس مقبرہ کی جدید تعمیر پچاس ساٹھ سال کا عرصہ ہو رہا ہے ہوئی ہے، مقبرہ اپنے طرز تعمیر کے لحاظ سے بڑا جاذب نظر اور پر شوکت ہے، آپ کا اصلی وطن بنارس تھا، عہد شاہجہانی میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کے کشف خوارق کے واقعات اجودھیا میں عام طور پر مشہور ہیں، ہندو مسلمان سب آپ کے مقبرہ پر حاضری دیتے ہیں، خاص و

عام میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص بلاناغہ چالیس دن آپ کے مزار پر آئے اور فاتحہ پڑھ کر اپنی جائز مراد کے لئے دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے مقصد کو پورا کردیتے ہیں، آپ سلسلۂ چشتیہ قادریہ میں خواجہ یحییٰ کے مجاز و خلیفہ تھے، شاہ دہلی محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۱۵ھ ۱۷۳۴ء میں آپ کی وفات ہوئی، ماہ رجب کی ۲۶، ۲۷ تاریخ کو آپ کا سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں بلاتفریق مذہب وملت ہندو مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں، آپ کے خاص مریدوں میں فدائی خاں صوبیدار تھا جس کا ذکر مسجد سورگ دواری کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

(۱۲)

مزار شاہ علی اکبر چشتی مودودی

مقبرہ شاہ ابراہیم کے پچھم محلہ شاہ مدار میں شاہ علی اکبر چشتی کا مکان اور خانقاہ تھی، نواب آصف الدولہ کے عہد میں آپ کا شمار اودھ کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا، آپ کے متوسلین اور عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی شاہان مغلیہ کے عہد میں آپ کے آباؤ اجداد کو بڑی بڑی جاگیریں ملی تھیں، افسوس کہ شاہ صاحب انھیں جاگیروں کی محبت اور ان کو ضبطی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ایک صحیح العقیدہ سنی خاندان میں پروان چڑھنے اور اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے اور صاحب نسبت شیخ ہونے کے باوجود آصف الدولہ کے ہمنوا بن گئے، اور اس دیار میں مذہب تشیع کو فروغ دینے کے سلسلے میں آصف الدولہ کے دست راست بنے رہے، حتیٰ کہ حسب تصریح مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی شاہ علی اکبر اور ملا محمد علی فیض آبادی ہی کی رائے اور مشورہ سے لکھنؤ میں پہلی بار ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو سید دلدار علی کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا کی

گئی، تاریخ کا یہی وہ پہلا دن ہے جب وسط ہند میں شیعوں نے اپنے جمعہ وجماعت کو سنیوں سے الگ کر لیا، "حُبّ الدّنیا رأس کل خطیئۃ" کی یہ کتنی واضح شہادت ہے کہ ایک شیخ وقت جب دنیا کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ سے دین صحیح کی تباہی و بربادی کے کیسے کیسے کام انجام پاتے ہیں، اللّٰہم احفظنا منہ،

شاہ علی اکبر چشتی کا سنگیں مزار آج بھی ایک مولسری کے درخت کے نیچے بلند چبوترہ پر موجود ہے، البتہ مکان اور خانقاہ کی عمارت کو انکے وارثوں نے منہدم کر کے اس کی اینٹیں اور عمارتی لکڑیاں سب فروخت کر دیں، اور آج مکان اور خانقاہ کی آراضی پر کاشت کی جا رہی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

۱۳

مزار پیر کشائی

اسی محلہ شاہ مدار میں تکیہ شاہ علی اکبر مودودی چشتی کے احاطہ کے اندر بلندی پر ایک بہت پرانی قبر ہے جو تقریباً چھ ہاتھ لمبی ہے، مشہور ہے کہ یہ پیر کشائی قدس سرہٗ کی قبر ہے، اور عوام میں یہ بات شہرت کے درجہ میں پہنچی ہوئی ہے کہ پیر کشائی سید سالار مسعود غازی علیہ الرحمہ کے استاذ تھے، چنانچہ اسی شہرت کی بنا پر جاہل عوام جو سالانہ سید سالار مسعود غازی کے عرس کے موقع پر بہرائچ جاتے ہیں وہاں جاتے وقت پیر کشائی کے مزار پر حاضری ضرور دیتے ہیں، قبر پر سنگ موسیٰ کا ایک کتبہ نصب ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن ایسے خط میں ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔

٭ ٭ ٭

(۱۴)

مقبرہ حضرت مخدوم بندگی نظام

حضرت شاہ فتح اللہ اودھی قدس سرہٗ کی خانقاہ کے مشرقی جانب ایک بلند چبوترہ پر چند قبریں ہیں۔ یہ چبوترہ درگاہ بندگی نظام کے نام سے مشہور ہے، آج سے ساٹھ ستر سال پیشتر اس جگہ ایک وسیع خانقاہ اور ایک قناتی مسجد کے آثار موجود تھے، لیکن اس وقت یہ آثار بھی گردش لیل ونہار کی نذر ہو چکے ہیں، البتہ حضرت مخدوم نظام کا مزار ایک احاطہ کے اندر اب بھی موجود ہے جس کے سرہانے نیم کا بہت پرانا درخت ہے، اس احاطہ کے باہر بھی بہت سی قبریں ہیں لیکن انکے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ یہ کن حضرات کی خوابگاہ ہے، مولوی عبدالکریم اودھی نے لکھا ہے کہ بندگی نظام کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ کون سے بزرگ ہیں اور کس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، ضلع سلطان پور کے کنولی موضع کے شیوخ اپنے آپ کو مخدوم نظام کی اولاد بتاتے ہیں۔

(۱۵)

خانقاہ شاہ مظفرؒ

خانقاہ شاہ فتح اللہ اودھی قدس سرہ کے جنوبی گوشہ میں حضرت شاہ مظفر صاحب معروف بہ شاہ بالجتی کی خانقاہ تھی مشہور ہے کہ آپ حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ کے عہد سلطنت میں تھے خانقاہ سے متصل عالمگیر شاہؒ نے ایک مسجد تعمیر کرادی تھی، خانقاہ کا نام ونشان تو اب مٹ گیا ہے البتہ مسجد آج بھی اچھی حالت میں باقی ہے، یہ مسجد اجودھیا کی ان چند خوش قسمت مسجدوں میں سے ایک

ہے جو نمازیوں سے آباد ہے، محلہ کوٹھی گھاٹ اور دورا ہا کنواں کے مسلمان پنجوقتہ جماعت سے نماز ادا کرنے کے لئے اس مسجد میں حاضر ہوتے ہیں، آج کل اس مسجد میں امامت کے فرائض جناب اخلاق احمد صاحب انجام دیتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم اودھی کے حسب تصریح حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمہ کے عہد حکومت میں خانقاہ و مسجد کے مصارف کے لئے خزانۂ شاہی سے چار سو اسی روپے کا سالانہ وظیفہ جاری کر دیا گیا تھا جو نوابین اودھ کے آخری دور تک برابر ملتا رہا، بعض معتبر لوگوں نے بتایا کہ کمپنی سرکار نے بھی کچھ دنوں تک قدرے کمی کے ساتھ اس وظیفہ کو باقی رکھا، لیکن جب انگریزی سرکار کا اودھ پر مکمل تسلط ہو گیا تو اس نے یہ وظیفہ بند کر دیا۔

۱۶

مزار پیر نصیر الدین

بابری مسجد کی پشت پر یعنی مغربی سمت زمانۂ قدیم سے ایک قبر پیر نصیر الدین کے نام سے مشہور چلی آرہی ہے، مولوی عبدالکریم اودھی متوفی ۱۳۰۸ھ کے زمانہ تک لوگ اس قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضری دیتے تھے، اور قبر کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام کرتے تھے، لیکن اب یہ جگہ بالکل ویران ہے، پیر نصیر الدین کے حالات بالکل معلوم نہیں ہیں، البتہ اجودھیا کے مشہور قومی کارکن محمد ہاشم انصاری کی روایت ہے کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ پیر نصیر الدین شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ کے زمانہ میں اودھ کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے،

واللہ اعلم بالصواب

٭

(۱۷)

مزار حضرت شاہ جلال

محلہ قضیانہ میں قاضی لطف اللہ انصاری (جو عہد عالمگیری میں اودھ کے صدر الصدور تھے) کی مسجد کے سامنے حضرت جلال شاہ کا مزار ہے، گری ہوئی عمارتوں اور بنیادوں کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر وسیع خانقاہ تھی، لیکن اس وقت ان آثار کا کہیں پتہ نہیں ہے بلکہ اس جگہ پر اب جدید مکانات تعمیر ہو چکے ہیں، حضرت شاہ جلال کو سید بڈھی کی عرفیت سے بھی اہل اودھ یاد کرتے تھے، حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے خلفاء میں ایک حضرت شاہ جلال الدین اودھی بھی ہیں جن کے بارے میں صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ "ایں بزرگ از بیشتر یاران اودھ در ارادت سابق بود و نزدیک ہمہ معظم و مکرم" [۲۰۵] یعنی حضرت جلال الدین حضرت سلطان المشائخ کی ارادت میں اکثر یارانِ اودھ پر سبقت رکھتے تھے اور تمام اودھی رفقاء ان کا اکرام و احترام کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں بزرگ کا یہ مزار ہو۔ واللہ اعلم۔

(۱۸)

مقبرہ شاہ اویس

اسی محلہ قضیانہ میں خانقاہ شاہ جلال کے پورب (موجودہ سڑک کی شرقی سمت) شاہ اویسؒ نامی بزرگ کا مقبرہ ہے، جو اجودھیا فیض آباد روڈ پر فرزند علی صاحب کے مکان کے پچھم سڑک سے پندرہ بیس میٹر اندر ایک احاطہ کے اندر واقع ہے یہ مقبرہ بہت اچھی حالت میں ہے، اس کی صفائی وغیرہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

لوگ اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے ہیں، اس وقت مقبرہ کے احاطہ میں اترجانب چند کمرے مع دالان بنادیئے گئے ہیں جن میں چھوٹے بچوں کا ایک اسلامیہ مکتب چل رہا ہے

شاہ اویس صاحب کے بارے میں مولوی عبدالکریم صاحب نے لکھا ہے کہ یہ اپنے دور میں اجودھیا کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے، اور تجرّد کی زندگی بسر کرتے تھے، جامع مسجد یعنی بابری مسجد کے خطیب قادر بخش جن کی عمر سو سال کے قریب تھی نے مجھ سے بتایا کہ بچپن میں میرے والد نے مجھے شاہ صاحب سے بیعت کرادیا تھا، خطیب موصوف قادر بخش کے والد کا نام محمد روشن تھا خطیب صاحب کی قبر شاہ اویس صاحب کے مقبرہ کے پائنتیں ہے۔

(۱۹)

مزار حضرت کمال الدین

محلہ سید واڑہ کے جنوب میں ایک قدیم مسجد نہایت خستہ حال میں ہے اسی کے متصل حضرت کمال الدین قدس سرہٗ کا مزار ہے چنانچہ اسی مناسبت سے پہلے اس محلہ کو محلہ کمال الدین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، شیخ کمال الدین کے بڑے بھائی جمال الدین تھے یہ دونوں حضرات اپنے وقت کے اہم روحانی پیشواؤں میں شمار ہوتے تھے، شیخ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ بھیکا (جن کا مزار موضع بلہری ضلع فیض آباد میں ہے) بھی اپنے عہد کے شیخ طریقت تھے، شیخ بھیکھا کی اولاد موضع بلہری میں آج بھی موجود ہے۔

(۲۰)

مزار نور الدین شہید

محلہ قضیانہ کے اتر سمت دریائے گھاگرا کے کنارے پر چکر تیرتھ نامی محلہ ہے، اب سے تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے یہاں ایک بلند ٹیلہ تھا جس پر شیخ نور الدین شہید کا مزار تھا، مولوی عبد الکریم اودھی نے لکھا ہے کہ زمانۂ ماضی میں اس ٹیلہ کو نور الدین شہید کا ٹیلہ کہا جاتا تھا، ایک سال دریائے گھاگھرا میں زبردست سیلاب آیا، جس کا پانی اس ٹیلہ سے آکر ٹکراتا تھا جس کے صدمہ سے بہت سی قبریں ٹوٹ کر دریا میں غرقاب ہوگئیں، مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جگہ کے آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹیلہ پر کوئی عمارت یا مقبرہ رہا ہوگا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے زینہ بھی تھا۔ مولوی عبد القادر صاحب مؤلف گم گشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ میں نے بچشم خود شاہجہاں بادشاہ کے عہد کا ایک فرمان دھنوتر گوشائیں کی اولاد کے پاس دیکھا تھا جس کی رو سے تیس بیگھہ اراضی گوشائیں کو آباد کرنے کے لئے دی گئی تھیں، فرمان مذکور میں آبادی کے لئے دی گئی اس زمین کی شمالی حد "ٹیلہ نور الدین شہید" بیان کی گئی تھی۔

مولوی عبد الکریم صاحب نے شہید نور الدین کا یہ واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک سال برسات کے پانی سے شہید موصوف کی قبر کھل گئی تھی تو دیکھا گیا کہ آپ کا مکمل جسم صحیح و سالم تھا، حتی کہ سارے دانت اپنی جگہ چمک رہے تھے، پھر دوبارہ قبر کنکر وغیرہ سے بند کر دی گئی، نور الدین شہید کے مزار پر ایک بہت بڑا قدیم املی کا درخت سایہ کئے ہوئے

ان مذکورہ مقابر و مزارات کے علاوہ سید سالار مسعود غازی کے رفقاء

کے مزارات ہیں جو گنج شہیداں کے نام سے موسوم ہیں، نیز مولانا کریم الدین شاہ، خلیفہ شیخ جمال الدین، پانجی شاہ درویش، قطب شاہ خلیفہ پانجی شاہ، شیخ سید ارتضیٰ، سید مرتضیٰ و سید عثمان شاہ، شیخ عالم شہید، شیخ علاء الدین خلیفہ مرزا مظہر جان جاں، خواجہ ہٹی وغیرہ کے مزارات بھی اجودھیا میں ہیں، جن میں سے کچھ کے آثار و نشانات آج بھی باقی ہیں، علاوہ ازیں باب اول میں اجودھیا کے مشائخ کے ضمن میں بھی بہت سے حضرات کے مزارات کا ذکر گذر چکا ہے۔ مزارات اور قبرستان کی کثرت سے یہ اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اجودھیا ایک عرصہ تک مسلمانوں کی علمی و روحانی سرگرمیوں کا مرکز رہ چکا ہے، اور اس سرزمین میں اسلام کے نہ جانے کتنے درخشاں لعل و گہر مخفی ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام، والصلوٰۃ والسلام علی سید الانام وعلیٰ آلہ واصحابہ الکرام

حوالے کی کتابیں

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنفین و مؤلفین
۱	بحر زخار	شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی
۲	نزہتہ الخواطر	مولانا عبدالحئ حسنی رائے بریلوی
۳	تکملہ تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی
۴	دہلی کے بائیس خواجہ	ظہورالحسن شارب
۵	سیرالاولیاء	سید مبارک الملقب بہ میر خرد کرمانی دہلوی
۶	اخبار الاخیار	شیخ عبدالحق محدث دہلوی
۷	خزینۃ الاصفیاء	غلام سرور لاہوری
۸	تذکرہ علمائے ہند	مولوی احسان علی
۹	تاریخ مشائخ چشت	پروفیسر خلیق نظامی
۱۰	منبع الاشراف	شیخ معین الدین جھوسوی
۱۱	گم گشتہ حالات اجودھیا	مولوی عبدالقادر اودھی
۱۲	لطائف اشرفی	شیخ مخدوم اشرف سمنانی کچھوچھوی
۱۳	سبحۃ المرجان	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی
۱۴	مآثرالکرام	" " "
۱۵	شجرۃ الانوار بحوالہ تاریخ مشائخ چشت	پروفیسر خلیق نظامی

مصنفین و مؤلفین	اسمائے کتب	نمبر شمار
	تکملہ خیر المجالس	۱۶
	سیرت اشرف	۱۷
مولوی نذیر احمد دیوبندی	تذکرۃ العابدین	۱۸
سید محمد اقبال جون پوری	تاریخ شیراز ہند	۱۹
ڈاکٹر دبیر احمد فیض آبادی	شہر اولیاء	۲۰
شاہ علی انور قلندر	انتصاح عن ذکر اہل الصلاح	۲۱
سید محمد امیر حسن مداری	تذکرۃ المتقین	۲۲
شیخ یٰسین بنارسی	مناقب العارفین قلمی نسخہ مظہر العلوم بنارس	۲۳
مولانا عبد الحیٔ حسنی	الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اردو	۲۴
شاہ مسعود علی قلندر	فصولِ مسعودیہ	۲۵
سیّد صباح الدین	بابری مسجد پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں	۲۶
سید کمال الدین حیدر حسنی المعروف بہ سید میر حیدر	قیصر التواریخ	۲۷
مولانا عبد السمیع ندوی	بابری مسجد غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں	۲۸
اے، ایل، باشم	ہندوستان کا شاندار ماضی	۲۹
مرزا جان	حدیقۂ شہداء	۳۰
منشی رام سہائے تمنا	افضل التواریخ	۳۱
مولوی نجم الغنی رام پوری	تاریخ اودھ	۳۲
مولوی عظمت علی کاکوروی	امیر علی شہید اور معرکۂ ہنومان گڑھی	۳۳
مرزا رجب علی بیگ سرور	فسانۂ عبرت	۳۴
حافظ عماد الدین ابن کثیر	البدایہ والنہایہ ج ۱	۳۵

نمبر شمار	اسمائے کتب	مصنفین ومؤلفین
۳۶	الجامع لاحکام القرآن ج ۶	امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی
۳۷	ہندوستان اسلام کے سائے میں	مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی بھوپالی
۳۸	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ
۳۹	مقدمہ تاریخ ہند جلد ۱	اکبر شاہ نجیب آبادی
۴۰	کمیونل ہسٹری اور رام کی اجودھیا ہندی	ڈاکٹر رام سرن شرما
۴۱	آئین اکبری	علامی ابوالفضل
۴۲	مختصر تاریخ ہند	ڈبلو، ڈبلو ہنٹر
۴۳	مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ	چودہری غلام رسول، ایم۔ اے

رسائل و اخبارات

۴۴ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، شمارہ ۳، جلد ۲۹، ص ۱۷۹

۴۵ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی ۱۳ تا ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء

۴۶ روزنامہ قومی آواز ۶ نومبر ۱۹۹۰ء

۴۷ " " ۲۴ اکتوبر "

۴۸ ایٹک سنواد دہلی (ہندی) نومبر ۱۹۸۴ء

۴۹ مسلم انڈیا دہلی (انگریزی) مارچ ۱۹۸۶ء

۵۰ روزنامہ مشرقی آواز دہلی ۲۷ اپریل ۱۹۸۶ء